مُحسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

اور

مُحسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم

از

فقیر سیّد وحید الدّین

دفتر

فقیر سپننگ ملز لمیٹڈ

۳۶/۱ کیمبل سٹریٹ، کراچی (پاکستان)

نقشِ اوّل　　　　سنہ ۱۹۶۳ء　　　　دو ہزار

ہدیہ فی جلد
پانچ روپے

طابع و ناشر: فقیر سیّد وحیدُالدّین

مطبوعہ
لائن آرٹ پریس، دی مال، لاہور

ملنے کے پتے:-
(۱) فقیر سپننگ ملز لمیٹڈ، ۳۶/۱ کیمبل سٹریٹ کراچی
(۲) لائن آرٹ پریس، دی مال، لاہور

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

آج سے چالیس سال پہلے کی بات ہے، جب حکومتِ برطانیہ اپنے عروج و شباب پر تھی، مجھے دسویں جماعت کے نصابِ تعلیم کی تیاری کے لیے نپولین کی زندگی پر ایک مختصر سی کتاب جو بہت سے بہت سو، سوا سو صفحوں کی ہو گی، پڑھائی گئی۔ اِس کتاب کا میں نے سرسری مطالعہ نہیں کیا، بلکہ سبقاً سبقاً پڑھا۔ جوانی کا آغاز تھا۔ اُس وقت میرا مطالعہ بہت ہی محدود بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ نہ ذہن میں پختگی پیدا ہوئی تھی، نہ نگاہ میں گہرائی۔ اس لیے مَیں نپولین کی زندگی کے اس پہلو کا، جسے "اولوالعزم کارنامے" (ADVENTURES) کہا جاتا ہے، تجزیہ نہ کر سکا۔

اس کتاب نے دل و دماغ پر بڑا گہرا نقش قائم کیا۔ نپولین کی شخصیت سے مجھے دلچسپی پیدا ہو گئی اور مَیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نپولین کے متعلق کتابیں پڑھنے لگا۔ ذہن و فکر پر بہت دن تک نپولین ایسے چھایا رہا، جیسے انسانی تاریخ کا "بطلِ جلیل" (GREAT HERO) وُہی ہے۔ مَیں روزمرہ کی گفتگو میں نپولین کی زندگی کی مثالیں فخر سے پیش کیا کرتا۔ یہاں تک کہ تیس سال بعد جب پیرس جانے کا اتفاق ہُوا تو دل نے

اُس کی قبر دیکھنے کا تقاضا کیا۔

جب میں کمسن تھا تو دیکھا کرتا تھا کہ والدِ مرحوم ہر وقت اسلامی تاریخ کے مطالعے میں مشغول بلکہ محو ہیں۔ اُنھوں نے مجھے بھی اِن کتابوں کے مطالعے کی رغبت دِلائی، لیکن افسوس کہ بچپن کی لااُبالی اور جوانی کی ترنگ میں اُن کے قیمتی مشورے پر مَیں نے توجہ نہ کی۔ پھر یورپ کے سفر سے واپسی کے کچھ عرصے کے بعد سیرت کی ایک مختصر سی کتاب میرے ہاتھ لگ گئی اور مَیں نے اُسے پڑھ ڈالا۔ یہ ایک اتفاقیہ واقعہ تھا، لیکن اس کتاب کے مطالعے نے مجھے اس درجہ متأثّر کیا کہ اس مقدّس زندگی کے مفصّل حالات پڑھنے کا غیر معمولی شوق اور جذبہ پیدا ہو گیا۔

سیرتِ طیّبہ پر کتابیں ملتی رہیں اور مَیں مُطالعے کی سعادت حاصل کرتا رہا۔ حضُورِ سرورِ کائناتِ فخرِ موجُودات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مقدّس زندگی کے مُطالعے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت روشن ہُوئی کہ مَیں نے اپنی عزیز زِندگی کا بیشتر حصّہ اور قیمتی زمانہ ان سلاطین کی ذہنی پرستش اور مدح و توصیف میں گزارا جن کی زندگی کا خلاصہ اور نچوڑ یہ تھا کہ جتنی دَولت وہ اپنے اسراف کے لیے جمع کر سکتے تھے کی، اور جتنے زیادہ سے زیادہ بنی نوعِ اِنسان کو غلام بنا سکتے تھے، بنایا۔ انسانیت کی فلاح و بہبُود ان کا مقصدِ حیات نہ تھا۔

غیر قومیں تو اس امر پر مجبُور ہیں کہ وہ نپولین جیسے کشور کشاؤں اور جرنیلوں کو اپنی قوم کے سامنے نمُونہ بنا کر پیش کریں کیونکہ ان کے علم و خبر کی ساری پُونجی یہی ہے۔ لیکن اُمّتِ مُسلمہ ان زندگیوں کے مطالعے کی محتاج نہیں ہے۔ اُس کی تو قومی وراثت میں اس مقدّس زندگی کا مکمّل نمُونہ موجود ہے۔ جو انسانی حیات کے ہر شعبے میں راہ نما اور

ہر گوشے کے لیے مشعلِ ہدایت ہے۔ یہی وہ پاک و بابرکت زندگی تھی، جس نے پست و جاہل قوم کے افکار میں وہ تغیّر و انقلاب پیدا کیا کہ ۲۳ سال کی مختصر مدت میں دُختر کُش، یتیم پرور، راہزن، امین اور اُونٹوں کے ساربان حکمرانی اور جہاں بانی کے معلّم بن گئے۔

اس اختصار پسند دور میں جب کہ زمان و مکاں کے فاصلے سمٹ رہے ہیں، اِس فقیر نے نہایت ہی مختصر سوانحِ حیات پیش کرنے کی کوشش اور جسارت کی ہے تاکہ کم سے کم وقت میں قرنِ اولیٰ کے نمایاں واقعات پڑھنے والوں کی نگاہوں سے گزر جائیں۔ لوگوں کو اسلامی ادب و تاریخ کے مُطالعے سے دِل چسپی پیدا ہو اور خاص طور سے ہمارا نوجوان طبقہ اِنسانیت کے مُحسنِ اعظمؐ کی سیرت اور حضورؐ کے ان رفقاءؓ کے حالات کو (جن کی زندگی میں آپ کی تعلیم و تربیت کا پورا عکس نظر آتا ہے) غور و فکر کا موضوع اور عمل کے لیے نمونہ بنائے اور اپنی زِندگی کے اوقات اِدھر اُدھر ہونے کی تلاش میں ضائع نہ کریں۔ جیسے مَیں نے اپنا وقت، پیسہ اور توانائیاں ضائع کیں اور بہت سی قوتیں کھو کر سمجھ آئی ہے۔

اگر میری اِس کوشش سے ایک پڑھنے والا بھی متأثر اور مُستفید ہو جائے تو میرے لیے یہی اطمینان کا باعث ہو گا۔ اور میں سمجھوں گا، میری محنت ٹھکانے لگ گئی اور اِس کتاب کا مقصد پُورا ہو گیا۔

"الفقیر"
۲۷ سی گلبرگ، لاہور
۸ ستمبر ۱۹۶۳ء

طالبِ نجات
فقیر سیّد وحیدُالدّین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بلغ العلیٰ بکمالہٖ
کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ
صلّوا علیہ و آلہٖ

۱۳۸۳ھ حبیب ۱۹۶۳ء

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جو کمالات عطا فرمائے تھے اُن کے سبب آپؐ انتہائے بلندی پر فائز ہو گئے۔

آپؐ کے حُسنِ اخلاق اور جمالِ کردار نے اندھیرے کو روشن کر دیا۔

آپؐ کی تمام عادات و خصائل نیک، پاکیزہ اور حسین تھیں۔

آپؐ پر اور آپؐ کی آل پر درود و سلام ہو!

(مشہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

ولادت

جزیرہ نمائے عرب میں مکہ کعبۃ اللہ کی حرمت، مقبولیت اور مرکزیت کی وجہ سے بہت مشہور شہر ہے۔ اسی مکے میں قبیلۂ قریش آباد تھا۔ جس کے خاندان بنو ہاشم کے سردار عبدالمطلب کعبے کے متولی تھے۔ ان کے گھر ۹ ربیع الاوّل، پیر کے دن (۲۲ اپریل ۵۷۱ء) صبحِ صادق کے وقت ایک یتیم پوتا تولد ہوا۔ اس بچّے کے باپ عبداللہ تجارتی سفر کے دَوران میں مدینے میں وفات پا چکے تھے۔ دادا نے اس نومولود کا نام محمدؐ رکھا۔ یہ نام قریش کے مروّجہ اور مقبول ناموں سے مختلف تھا، اس لیے لوگوں نے عبدالمطلب سے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس کے جواب میں وہ بولے :

"یہ نام اس توقع پر رکھا ہے کہ زمین و آسمان میں میرے فرزند کی تعریف ہو۔"

رؤسائے عرب کے یہاں یہ دستور تھا کہ شیر خوار بچے بدوی دائیوں کے سپرد کر دیتے، جو ان کی پرورش اور تربیت کرتیں اور جب یہ بچے نو دس سال کے ہو جاتے تو ان کے والدین کو واپس کر جاتیں۔ ہاشمی خانوادے کا یہ بچہ حلیمہ دائی کے

حصے میں آیا۔ جس نے قدرے تامل کے بعد اس ذمے داری کو سنبھالا، کیونکہ یہ بچہ یتیم تھا اور یتیم بچے کو اپنے گھرلے جا کر کوئی دائی مالی اعتبار سے زیادہ فائدے کی امید نہیں رکھ سکتی حلیمہ خلافِ معمول اس بچے کو پانچ سال کی عمر میں اس کی ماں آمنہ بی بی کو واپس کر گئیں۔ اس دوران میں ایک دو بار بچے کو اس کے گھر والوں سے ملانے کے لیے بھی مکے لایا گیا۔ یہ بچہ ان معصوم بچوں میں سے تھا جنھوں نے باپ کا نام تو سنا ہو مگر آنکھیں باپ کی صورت دیکھنے کو ترستی ہوں۔

ماں بیٹے کو باپ کی قبر دکھانے اور ننھیال والوں سے ملانے کے لیے مدینے لے گئی۔ بچے نے، جو فطرتاً غیر معمولی حساس اور ہوش مند تھا، یہ سات آٹھ دن کا طویل سفر اس عالم میں طے کیا، جیسے وہ آثارِ کائنات اور صحیفۂ فطرت کا مطالعہ بڑے غور و فکر کے ساتھ کر رہا ہے۔ واپسی پر مقام ابواء میں ماں بیمار ہوئیں اور چند روز کی علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ ماں کے پردیس اور سفر میں اس طرح اٹھ جانے سے اس بچے کا گدازِ قلب اور بڑھ گیا۔ پیاری ماں کو نزع اور موت کی جس کش مکش سے گزرنا پڑا، اس بچے نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اُمِّ ایمن کنیز اس سفر میں ہمراہ تھی۔ وہ اس کمسن بچے کو لے کر مکے آئی اور اس کے دادا عبدُالمطلب کے سپرد کر دیا۔

جب یہ بچہ سفر کے لیے روانہ ہوا ہے تو باپ کا سایہ نہ تھا اور جب مکے واپس آیا تو ماں کی مامتا سے بھی محروم ہو گیا۔ دادا نے بڑی شفقت اور محبت سے یتیم پوتے کی پرورش کی، مگر ابھی صرف آٹھ ہی سال کی عمر تھی کہ دادا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ اب اس کی پرورش کا ذمّہ اس کے چچا اَبُو طالب (حضرت علیؓ کے والد) نے لیا۔ ابُو طالب اور ان کی بیوی فاطمہ بنتِ اسد (حضرت علیؓ کی والدہ) نے اس بچے کو اپنی اولاد کی

طرح پالا۔ بچہ طبعاً کم سخن اور نیک تھا۔ وہ اکثر غور و فکر میں ڈوبا ہُوا پایا جاتا۔ بُت پرستی سے اس کو فطرتاً نفرت تھی۔

یہ نونہال جس کی عُمر اب بارہ سال کی ہو گئی تھی، اپنے شفیق چچا ابُوطالب سے اتنا مانُوس ہو چکا تھا کہ جب ابُوطالب تجارتی کاروبار کے لیے شام جانے لگے تو اس بچے نے چچا کے ساتھ جانے کی خواہش کی۔ دُور دراز کا سفر، کٹھن منزلیں۔ چچا اس سخت و دشوار سفر میں کمسن بھتیجے کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار نہ تھے، مگر اُس کے اصرار پر ساتھ لے جانے کی ہامی بھر لی اور لے بھی گئے۔

اس کمسن نے جب ہوش سنبھالا اور اپنے گرد و پیش کے ماحول پر نظر ڈالی تو دیکھا قمار بازی، شراب خواری، بُت پرستی اور بے حیائی معاشرے کا جُز بن چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا تصور تو پایا جاتا ہے مگر اس تصور کو بُت پرستی کے ذوق و شوق نے بہت کچھ دُھندلا کر دیا ہے۔ کچھ بُت تو ایسے ہیں جو بہت مشہور ہیں اور سب کے نزدیک محترم ہیں۔ خاص طور سے وہ بُت جو کعبے میں نصب ہیں۔ ان سے تو تمام قریش کی مشترک عقیدت وابستہ ہے۔ ان کے علاوہ ہر گھرانے میں اپنے بنائے ہُوئے بُت موجود ہیں۔ بُت پرستی کے شوق کا یہ عالم کہ قریش سفر میں جاتے ہیں تو ستُو کے بُت بنا لیتے ہیں اور جب ضرورت پڑتی ہے تو اپنے ان خداؤں کو گھول کر پی لیتے ہیں۔

قریش کے معاشرے اور عرب کے ماحول میں عورت بے چاری کی حالت اتنی پست و ذلیل اور ناگفتہ بہ ہے کہ عورت اُونٹوں، بکریوں اور غلّے کی طرح تجارتی جنس بن چکی ہے۔ شادیوں پر کوئی پابندی اور روک نہیں۔ ایک مرد جتنی عورتوں سے چاہے شادی

کر سکتا ہے اور دوسری طرف عورت بھی جتنے مردوں کو پسند کرے، ان سے تعلق پیدا کر سکتی ہے۔ چوری چھپے آشنائی سے لے کر کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری تک ہر برائی پائی جاتی ہے۔ پستی اور گراوٹ کی انتہا ہے کہ منقولہ اور موروثی جائداد کی طرح باپ کی بیویاں بھی بیٹے کو ورثے میں ملتی ہیں اور وہ اپنی حقیقی ماں کے علاوہ سوتیلی ماؤں سے شادی کرنے میں کسی قسم کی عار و شرم محسوس نہیں کرتا۔ اس بے غیرتی کے ساتھ عربوں میں ایک شدید مجرمانہ قسم کی غیرت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ ہماری لڑکیاں کسی کو بیاہی نہ جائیں۔ کوئی مرد ہمارا داماد نہ بنے۔ اس شقاوت آمیز غیر فطری غیرت کے سبب لڑکیاں زندہ دفن کی جاتی ہیں اور اس بے رحمی پر الٹا فخر کیا جاتا ہے۔ آقا کو غلاموں کی موت اور زندگی پر پورا مالکانہ اختیار حاصل ہے۔ ملک میں کوئی مرکزیت نہیں پائی جاتی۔ ہر قبیلہ اپنے ایک سردار کے ماتحت خود مختار بنا ہوا ہے۔ اس چیز نے قبائل کو شدید قسم کی رقابتوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر تلواریں نیام سے باہر آجاتی ہیں اور بڑی ہولناک جنگیں ہوتی ہیں۔ جن کا سلسلہ کئی کئی پشتوں تک جاری رہتا ہے اور آنے والی نسلیں اپنے اسلاف اور آبا و اجداد کے خون کا انتقام لیتی ہیں۔ گھڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑانے پر جھگڑا، کھیتوں میں بکریاں چرانے اور چشموں پر پانی بھرنے پر فساد اور فساد بھی خون ریز۔ اپنے دشمنوں کو قتل کر کے ان کی کھوپڑیوں میں شراب تک پیتے ہیں۔

عرب قوم عام طور پر لکھنا پڑھنا نہیں جانتی، مگر اپنی شاعری اور زبان دانی پر اس قدر نازاں اور غرہ ہے کہ ساری دنیا کو اپنی فصاحت و شاعری کے مقابلے میں "عجم" یعنی گونگا سمجھتے ہیں۔ توہم پرستی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر فال نکالتے

ہیں۔ پانسے پھینکتے ہیں۔ ہر طرف کہانت کا زور ہے۔ کاہنوں سے اپنی تقدیر اور مستقبل کے بارے میں باتیں پوچھتے ہیں۔

یہ افسوس ناک حالات عرب ہی تک محدود نہ تھے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں ایسی ہی ابتری اور پستی پائی جاتی تھی۔ کہیں آگ کی پوجا ہوتی تھی، کہیں محبت اور نفرت کے دیوتاؤں کے آگے سر جھکائے جا رہے تھے۔ غرض اللہ تعالیٰ کے سوا اُس کی ساری مخلوق پوجی جا رہی تھی۔ انتہا یہ ہے کہ سانپ، بندر اور درخت تک مسجود و معبود بنے ہوئے تھے درخت، پتھر، جانور، چاند سورج، ستارے یہاں تک کہ حشرات الارض کی پرستش نے ساری دنیا کو شرک کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ ہر طرف جہالت کا اندھیرا اور شرک و بدعت کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔ جن میں صراطِ مستقیم چھپ کر اور گم ہو کر رہ گیا تھا۔

عرب کے باشندے اسی آدمی کو قابلِ عزت اور شریف سمجھتے تھے جس کے پاس بہت زیادہ اُونٹ، بکریاں اور کھجوروں کے باغ ہوں۔ بہت سی دولت ہو۔ نوکر، چاکر، لونڈیاں اور غلام ہوں۔ نیکوکاری اور تقویٰ کا تصور ہی ان کے ذہنوں سے رخصت ہو چکا تھا۔ یہی وہ دور ہے، جسے "دورِ جاہلیت" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عرب کے معاشرے کی برائیوں نے ان کی فطری صلاحیتوں کو دبا دیا تھا۔ مثلاً شجاعت، جوشِ آزادی، پابندیِ عہد، مہمان نوازی، جفاکشی، فصاحت و زباں دانی، خود اعتمادی اور کسی کی مدد کے بغیر اپنی حفاظت خود کرنے کا جذبہ ان خوبیوں سے عرب آشنا تھے۔ انھیں صلاحیتوں کے اُبھارنے اور نشو و نما کے لیے ان کے ہاں یہ رواج تھا کہ بچّوں کو پیدا ہونے کے بعد بدویوں کے سپرد کر دیتے تاکہ صحرا کی کشادہ فضا میں نگاہ کے ساتھ ساتھ قلب کی وسعت

میں بھی اضافہ ہو، مہمان نوازی کا جذبہ اُبھرے اور ماں باپ کے قرب کے سبب جو جذبات میں ایک طرح کی انفعالیت پیدا ہو جاتی ہے، اس کی جگہ زندگی کے میدان میں اپنی حفاظت خود کرنے کی فاعلانہ قوت پیدا ہو۔ جہاں بانی، صبر و استقلال اور مُتحد رکھنے کا جو گُر بکریاں چرانے سے حاصل ہوتا ہے، جسے قدرت کا "نافذ کردہ نصاب" کہیں تو واقعے کی صحیح ترجمانی ہوگی اور جس منزل سے تقریباً ہر پیغمبر کو گزرنا پڑا ہے، بدوی زندگی کا نمایاں شعار تھی۔ عرب قوم کی یہ خصوصیات صحیح رہنمائی نہ ہونے کے سبب سے غلط راہوں پر پڑ گئی تھیں اور اُن کا بے جا استعمال ہو رہا تھا۔

مُلک میں بعض ایسے قبائل بھی پائے جاتے تھے، جو خانہ بدوش تھے اور جن کا کوئی مُعیّن مسکن اور مستقل سکونت نہ تھی۔ جہاں پانی کا چشمہ، سبزہ اور کھجوروں کے جُھنڈ نظر آئے، وہیں ڈیرے ڈال دیے اور جب یہاں سے جی اُکتا گیا تو اپنا مختصر سا سامان اُونٹوں پر لادا اور وہاں سے چل پڑے۔ کھجور عربوں کی خاص قومی غذا تھی۔ اونٹ، جسے ریگستان کا جہاز کہا جاتا ہے۔ وہ اُن کے لیے سب سے زیادہ کام کا جانور تھا، اُس کے بالوں سے کمبل اور پوشاک بناتے، اُس کا گوشت کھاتے اور دُودھ پیتے اور اُس کی کھال اور ہڈی سے ضرورت کی مصنوعات تیار کرتے اور اس سے سواری اور باربرداری کا کام لیتے۔

عرب کے بُرے ماحول نے اس نوجوان ــــ محمدؐ ابن عبداللہ ــــ کی طبیعت اور مزاج پر اتنا گہرا اثر کیا کہ اس خلش آمیز تأثر کو لیے ہُوئے وہ سب سے علیحدہ غور و فکر میں ڈوب جاتا۔ وہ ایک خاموش اور سنجیدہ نوجوان تھا۔ زبان سے کچھ

نہ کہنا مگر اس کے تیور دل کی خلش اور ذہن کی بے چینی کی ترجمانی کر رہے تھے۔ اس کی جوانی حُسنِ اخلاق کا بہترین نمونہ تھی۔ بیماروں کی تیمارداری، ہمسایے کے حقوق کا پاس و لحاظ، چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کی عزت، یتیموں اور بیواؤں کی امداد، بیکسوں اور ضعیفوں کی دستگیری اور ہر مظلوم و مصیبت زدہ کی حمایت اس نوجوان کا شیوہ تھا۔ اس کے جگر میں سارے جہان کا درد سمویا ہوا تھا۔ مکے میں ظلم و ستم اور خاص طور سے ضعیفوں اور ناداروں پر جور و تعدی کا دور دورہ تھا۔ اس معصوم و مقدس نوجوان کی تحریک پر ایک ایسی جماعت قائم ہوئی جس کے اغراض و مقاصد کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ ہر غریب مظلوم کی حمایت کی جائے اور اس کا حق دِلایا جائے۔ اس نوجوان کے حُسنِ اخلاق، راست بازی، دیانت اور پاک باطنی کو دیکھ کر اہلِ مکہ اپنی امانتیں اس کے پاس رکھتے۔ اپنے ذاتی معاملات میں مشورہ لیتے، اپنے جھگڑوں اور تنازعات کا اس سے فیصلہ کراتے۔ اِس نوجوان کے اخلاقِ حمیدہ، شرافت، نیکی اور معصومانہ بے داغ زندگی نے قریش کو اتنا متأثر کیا کہ وہ اُس کو "الامین" کے لقب سے پکارنے لگے۔

عرب بت پرستی کرتے تھے اور طرح طرح کی بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسوم میں مبتلا تھے، مگر کعبہ اب بھی سب کے نزدیک محترم اور مقدس تھا۔ اسی زمانے میں خانۂ کعبہ کی جب دوبارہ تعمیر ہونے لگی تو یہ مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا کہ حجرِ اسود کو کعبے کی دیوار میں نصب کرنے کی سعادت کِسے حاصل ہوگی۔ ہر خاندان اور قبیلہ اس شرف و سعادت کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح خاصی شدید برہمی اور کشمکش پیدا ہوگئی۔ بالآخر قریش نے اس نوجوان کو ثالث مقرر کیا۔ آپ نے چادر بچھا کر اس مقدس

پتھر کو اُس پر رکھ دیا اور قریش کے قبائل کے سرداروں سے کہا کہ سب مل جُل کر اِس چادر کو نصب ہونے کے مقام تک اٹھائیں۔ جب چادر مقامِ متعین تک اُٹھالی گئی تو آپؐ نے حجرِاسود اٹھا کر اپنے ہاتھ سے نصب کر دیا اور اس طرح آپؐ کی فراست نے قریش کو خوں ریز جنگ سے بچا لیا۔

قریش کے الامین، اور عبدُاللہ کے بیٹے محمدؐ کے چچا ابُوطالب کثیر العیال تھے۔ ان کا تجارتی کاروبار بھی سست ہو گیا تھا، جس کے سبب وہ مالی مشکلات محسوس کرنے لگے۔ مکّے میں خدیجہ نام کی ایک شریف اور نیک بیوہ تھیں جو قریش کے بعض اشخاص کو اپنا تجارتی سامان دے کر باہر کے مُلکوں میں بھیجا کرتی تھیں۔ ابو طالب نے اپنے بھتیجے کو مشورہ دیا کہ تم بھی خدیجہ کے وکیل بن کے اس کا مال لے جاؤ تو اچھا ہے۔ یہ خبر خدیجہ کو پہنچی تو اس نیک بی بی نے خود پیام بھیج کے آپ کو اپنا وکیل مقرر کر دیا۔ چنانچہ شام، بصرے اور یمن آپ کئی بار تجارتی سامان لے کر گئے اور اس قدر دیانت، محنت اور فراست سے یہ کام انجام دیا کہ پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ نفع حاصل ہُوا۔ آپ کے کردار کی پاکیزگی، دیانت اور فراست نے خدیجہ کے دل میں گھر کر لیا اور بی بی خدیجہ کا اعتماد اِس قدر بڑھا کہ ابُوطالب کے پاس آپ سے شادی کرنے کا پیغام بھجوایا جسے ابُوطالب نے منظور کر لیا اور اس طرح آپؐ کا نکاح بی بی خدیجہ سے ہو گیا۔ آپ کی عمر اُس وقت پچیس سال کی تھی اور بی بی خدیجہ چالیس سال کی تھیں۔ بی بی خدیجہ نے زید نامی غلام خدمت کے لیے آپؐ کی نذر کیا، جسے آپ نے اسی وقت آزاد کر دیا۔ زید آپ کے کریمانہ اور مشفقانہ طرزِ عمل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے والدین

کے شدید اصرار کے باوجود ان کے ساتھ نہیں گئے اور آپ ہی کی خدمت میں رہنے کو ترجیح دی۔ حضرت علیؓ جو کم سنی ہی سے آپ سے مانوس تھے، انھیں اپنے ہاں لے آئے

جب معاش کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو آپ ہفتے عشرے کی خوراک ستو اور کھجور اپنے ساتھ لے کر مکّے کے مشہور پہاڑ حرا کے ایک غار میں خلوت اِختیار فرماتے اور وہاں خضوع وخشوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پوری یکسوئی سے مشغول رہتے اور معاشرے کی وہ برائیاں اور بے اِعتدالیاں جنھوں نے آپ کو سخت کبیدہ خاطر کر رکھا تھا، ان پر غور وفکر فرماتے۔ شدید حیرت و انتظار کے عالم میں آپ زندگی بسر کر رہے تھے۔ جوں جوں چالیس سال کے سِن کا زمانہ قریب آتا گیا، غارِ حرا میں خلوت کی مدّت دراز وطویل ہوتی گئی۔

نبوّت

رمضان کے مہینے کا آخری عشرہ تھا۔ آپؐ حسبِ معمول غارِ حرا میں خلوت گزیں تھے کہ ایک دن وہاں سے ایک عجیب حیرت و اضطراب کے عالم میں گھر واپس تشریف لائے۔ آتے ہی لیٹ گئے اور بی بی خدیجہؓ سے فرمایا:

"مجھے کمبل اڑھا دو۔ مجھے کمبل اڑھا دو!"

بی بی خدیجہؓ نے آپؐ پر ایک چادر ڈال دی۔ کچھ دیر کے توقّف کے بعد آپؐ نے فرمایا:

"آج رات غارِ حرا میں ایک عجیب شکل نمودار ہوئی، جس نے خود کو اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ جبریل بتایا اور کہا کہ آپ کو اللہ نے نبی بنا لیا ہے اور پھر مجھ سے پڑھنے کے لیے کہا۔ جب میں نے کہا کہ میں اُمّی ہوں تو اُس نے اپنے سینے سے لگایا اور خوب بھینچا، اور پھر پڑھنے کے لیے کہا۔ میں نے پھر وہی جواب دیا تو اس نے پھر اسی طرح بھینچا۔ اسی طرح تیسری دفعہ بھینچنے کے بعد مجھ

سے کہا "پڑھ اپنے ربّ کے نام سے، جس نے ہر شے کو پیدا کیا۔
انسان کو خون کے لوتھڑے (جمع ہوئے خون) سے پیدا کیا۔ پڑھ!
تیرا ربّ عزّت والا ہے جس نے قلم کے ذریعے علم دیا۔ اور انسان کو
وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا"۔ جسے پڑھ کر میں کپکپی محسوس کرنے
لگا اور مجھے اپنی جان کا خوف ہوگیا"۔ (مفہوم)

بی بی خدیجہؓ نے، جو پہلے آپ کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی تھیں، تسلّی دیتے ہوئے کہا "نہیں، نہیں، آپ کو خوش ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی اس کام میں رُسوا نہیں کرے گا، کیونکہ آپ صلۂ رحمی کرتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں۔ مہمان نواز ہیں۔ محتاجوں اور غریبوں کی مدد کرتے ہیں اور نیک کام کرنے والوں کی اعانت فرماتے ہیں"۔

اس پیغامِ الٰہی کے بعد کچھ عرصے تک فرشتہ نہیں آیا۔ لیکن آپ غارِ حرا جاتے رہے، کیونکہ لذّتِ خطاب نے آپ کو بے تاب کر دیا تھا اور دل و دماغ اور ذہن و فکر کی دنیا اس خطاب اور عجیب مشاہدے کے بعد کچھ اور ہوگئی تھی۔ ایک دن پھر فرشتہ پیغامِ الٰہی لیے ہوئے نازل ہوا:۔

"اے چادر (نبوّت) کے اوڑھنے والے اُٹھ اور اپنے قریبی
رشتے داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرا"۔ (مفہوم)

اب کی مرتبہ پہلی جیسی حالت نہیں ہوئی۔ وہ اضطراب کا عالم تھا اور اب سکینت کی منزل تھی۔ وہ عظیم الشان ذمے داری اب مجسّم حقیقت بن کر سامنے آگئی تھی۔ آپؐ گھر تشریف لائے اور فرمانِ خداوندی کے مطابق اپنی رفیقۂ حیات بی بی خدیجہؓ کو اللہ کے

حکم سے آگاہ کیا۔ حضرت خدیجہؓ نے کسی تامل اور پس و پیش کے بغیر اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد آپؐ کے دوست حضرت ابوبکرؓ اور آپؐ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ اور آزاد کردہ غلام زیدؓ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو آپؐ کی زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو سے واقف تھے اور آپؐ کا کردار کتاب کی طرح ان کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ آپؐ کی دعوت پر ان کا ایمان لانا اس کی روشن دلیل ہے کہ آپؐ کی صداقت اور راست بازی ان کے نزدیک مسلّم تھی۔ کیونکہ آپؐ کی پہلی ہی دعوت پر انھوں نے اپنے آبا و اجداد کے مذہب کو چھوڑ دیا۔ 11434

آپؐ نے نہایت خاموشی سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کی جس شخص میں قبولِ حق کی ذرا سی بھی استعداد محسوس ہوئی، آپؐ نے خود اس کے پاس جا کر اسلام کی دعوت دی۔ اس طرح تین سال کا زمانہ گزر گیا، مگر صرف چالیس افراد کو ایمان و اسلام کی سعادت میسر آئی۔ یہ لوگ "سابِقُونَ الاَوَّلُون یا سابِقُونَ السّابِقُون" کہلاتے ہیں یعنی وہ جو سب سے پہلے اسلام لائے۔

ایک دن یہ پیغامِ الٰہی نازل ہُوا:

"جن باتوں کے لیے حکم دیا جاتا ہے، اسے کھول کر بیان کیجیے۔ حق و باطل کا فرق ظاہر کر دیجیے۔ انکار کرنے اور جھٹلانے والوں کی پروا نہ کیجیے۔ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیجیے اور سب سے کہہ دیجیے کہ میں برملا طور پر عذاب سے ڈرانے والا ہوں"۔ (مفہوم)

چنانچہ آپؐ نے حکمِ الٰہی کے مطابق کوہِ صفا پر چڑھ کر اہلِ مکّہ کو پکارا اور جب

لوگ جمع ہو گئے تو پہلے آپؐ نے ان سے اپنے صادق اور امین ہونے کا اقرار لیا، اور پھر آپؐ نے اللہ کے سوا کسی غیر کی عبادت نہ کرنے، پاکیزہ رہنے، فحش باتوں سے بچنے، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنے، توہم پرستی سے باز رہنے، بتوں کی پوجا نہ کرنے کی تلقین کی تو یہ لوگ بگڑ گئے۔ خاص طور سے آپؐ کا چچا ابُولہب بڑی تُرش رُوئی سے پیش آیا۔ قریش نے آپؐ کی اس تبلیغ اور پیغامِ حق و صداقت کو اہمیت ہی نہیں دی۔ وُہ اِس غلط فہمی میں مُبتلا رہے کہ یہ عارضی جوش اور وقتی جذبہ ہے جو خود بخود ٹھنڈا ہو جائے گا۔

رضاعت و طفولیت کے پانچ چھ سال نکال کر بقیہ ۲۵ سالہ مکّی زندگی کی پہلی منزل اس غور و فکر اور تردُّد و اضطراب میں گُزری کہ انسان کی فلاح و نجات کے لیے کوئی صحیح راستہ نظر آئے۔ دوسری منزل کا آغاز اس صراطِ مُستقیم کے نظر آنے کے بعد ہوتا ہے، جس کے لیے بقیہ زندگی کا ہر لمحہ ایثار و قُربانی کے لیے وقف ہو گیا۔

مکّے کے نواح میں سال کے سال ایک میلہ لگا کرتا تھا، جس میں عرب کے تقریباً سارے قبیلے اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ اِس میلے میں خرید و فروخت کی خوب گرم بازاری رہتی شعر و سخن، فصاحت و بلاغت اور قصّہ گوئی کے مقابلے ہوتے، جن میں فحش اور بے حیائی کی باتیں بیان کی جاتیں۔ تیغ زن، شہسوار اور پہلوان اپنے کرتب دکھاتے اور اپنی سنگدلی، شقاوت، خوں ریزی کے قصّے فخر کے ساتھ بیان کرتے۔ یہ میلہ کیا تھا، کبر و فخر اور فحاشی کی نمائش تھی۔ اِس میلے سے واپس ہوتے ہُوئے خانۂ کعبہ کا طواف بھی کرتے جاتے۔ نبوّت سے قبل رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اِس قسم کے میلوں اور اجتماعات میں شرکت نہیں کی تھی اس قسم کی تمام باتیں بچپن ہی سے آپ کے مزاج و طبیعت کے خلاف تھیں۔ مگر اب آپؐ

کو اسلام کی تبلیغِ عام کا فریضہ انجام دینا تھا۔ اِس کے لیے آپؐ نے عام گزرگاہوں پر میلے میں شریک ہونے والوں کو اللہ کا پیغام پہنچایا۔ یہ لوگ آپؐ کا مذاق اڑاتے۔ طرح طرح کے آوازے کستے، فقرے چُست کرتے، لیکن آپؐ نے صبر و سکون کے ساتھ ہر ناگوار بات اور طنز کو گوارا کیا۔

اسی طرح ایامِ حج میں آپؐ باہر سے آئے ہوئے ہر قبیلے کے پاس جاتے اور دین کی تبلیغ فرماتے۔ ابُولہب اور ابُوجہل آوارہ لڑکوں کو اُکسا دیتے، جو طرح طرح کی بدتمیزیاں اور گستاخیاں کرتے اور شور و غل مچاتے تاکہ آپؐ کی بات نہ سنی جا سکے۔ ابُولہب لوگوں سے خاص طور پر کہتا کہ یہ میرا بھتیجا ہے جو (خاک بدہنِ گستاخ) پاگل ہوگیا ہے۔ اس کی بات سُننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ دوسرے لوگ یہ دیکھ کر کہتے کہ جو شخص اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، جب اس کا چچا ہی اسے (معاذ اللہ) پاگل سمجھتا ہے تو ہم اس کی بات کیسے مان لیں۔

کفارِ مکہ کی ایذا رسانی

کفارِ مکہ کے شور و غُل مچانے، مذاق اڑانے اور آپؐ کو پاگل اور مجنوں مشہور کرنے سے بھی جب حق و صداقت کا دھارا نہ رک سکا اور مسلمانوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا تو اب ظالم اور حق ناشناس جھنجھلا کر ایذا رسانی پر اُتر آئے۔ آپؐ پر غلاظت ڈالتے، راستے میں کانٹے بچھاتے اور کُوڑا کرکٹ پھینکتے۔ ایک دن تو یہ نوبت تک آگئی کہ آپؐ کے گلے میں چادر ڈال کر اس قدر سختی کے ساتھ بل دیے کہ آپ کا دم گھٹنے لگا۔ حضرت ابُوبکرؓ نے بڑی جرأت کے ساتھ مزاحمت کی اور آپؐ کو چھڑاتے ہوئے کہا کہ تم اللہ کے اس نیک بندے کو صرف اِس جرم میں ہلاک کرنا چاہتے ہو کہ یہ کہتا ہے "اللہ ایک ہے"۔ اِس پر کفار نے ابُوبکرؓ کو اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہوگئے۔

کفارِ مکہ کے ظلم و ستم میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جو نیک لوگ کفر

وجہالت کی تاریکی سے نکل کر ایمان و اسلام کی روشنی میں آگئے تھے، ان کو یہ بدبخت طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دیتے۔ کسی کو عین دوپہر کے وقت جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر اس کے سینے پر بھاری پتھر رکھ دیتے۔ کسی کو کھال میں بند کر کے کھال کو سی دیتے اور دھوپ میں ڈال دیتے کسی کے پاؤں میں رسّی باندھ کر گلی گلی گھسیٹتے پھرتے۔ کسی کو اتنا مارتے کہ وہ بے چارہ ان ضربوں کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو جاتا۔ مگر ان اذیتوں، تکلیفوں اور جفاکاریوں کے باوجود کسی ایک صاحبِ ایمان کے بھی پاؤں نہیں ڈگمگائے۔ بلکہ مار کھا کر، تکلیفیں اٹھا کر اور مصیبتیں جھیل کر ایمان کا نشہ اور تیز ہو جاتا۔ مسلمانوں کے صبر و استقامت اور ثبات و عزیمت کو دیکھ کر کافروں نے سوچنا شروع کیا کہ یہ کوئی وقتی جوش اور عارضی تحریک نہیں ہے جسے دبایا جاسکے۔ یہ دعوت تو عظیم الشان انقلاب کا پیش خیمہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو پرستش اعمال کا مختار صرف خدائے واحد کو قرار دیتی ہے۔ یہ دعوت اگر کامیاب ہو گئی تو ہمارے ان بتوں کی خدائی ختم ہو جائے گی۔ ان بتوں کی، جن کی ہمارے آباد اجداد کے وقت سے پرستش ہوتی چلی آئی ہے اور جو ہماری عقیدت کا مقدس نشان ہیں۔ یہ انسانی بھائی چارے کی دعوت ہمارے نسلی امتیازات پر خطِ تنسیخ کھینچ دے گی اور عرب کے فخر و غرور کی بساط ہی الٹ جائے گی۔ بت پرستی کی بدولت جو عہدے اور منصب ہمیں ملے ہوئے ہیں وہ چھن جائیں گے۔ محمدؐ ابنِ عبداللہ اور اُن کے ساتھی جن لذّتوں اور عیش و تفریح کی باتوں سے ہمیں روکتے ہیں۔ ان کے بغیر زندگی بالکل بے مزہ اور خشک ہو کر رہ جائے گی۔ ہم ان نقصانات کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ دعوت ہمارے اقتدار کے لیے مستقل خطرہ ہے۔ اس سے تو ہمارے عیش و تفریح میں خلل پڑ جائے گا۔ یہ سوچ کر کفارِ مکہ اسلامی تحریک کو کچلنے کے لیے پوری طرح کمربستہ

ہو گئی۔

کفارِ مکہ نے ہر طرح کے شدید سے شدید ظلم کر کے دیکھ لیا مگر انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس ناکامی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے مشورے ہونے لگے۔ عرب کا ہر قبیلہ اپنے افراد کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوتا تھا۔ اس لیے ہر منصوبۂ قتل عملی صورت اختیار کرنے سے پہلے ہی ناکام ہو جاتا۔ بالآخر انھوں نے یہ طے کیا کہ ابو طالب جو ابھی تک اپنے آبائی مذہب پر قائم ہے، پہلے اس سے کہا جائے۔ وہی اس کا کوئی مناسب بندوبست اور روک تھام کر دے گا۔ اس طرح ہمیں آئے دن کی پریشانیوں سے نجات مل جائے گی۔ چنانچہ کفارِ مکہ کا ایک وفد ابو طالب کے پاس آیا اور کہا کہ تم اپنے بھتیجے سے کہو کہ وہ اپنی تبلیغ سے باز آئے۔ ابو طالب نے بڑی نرمی اور شائستگی سے اس وفد کے آدمیوں کو سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سرسری طور سے سمجھا دیا۔ ساری مخالفتوں، اذیتوں اور خطروں کے باوجود آپ تبلیغِ دین میں مصروف رہے۔ اس طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غفلت نہیں ہوئی، اس لیے کفارِ مکہ پھر دوبارہ ایک وفد کی شکل میں ابو طالب سے آکر ملے اور شکایت کی کہ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ ہم اپنے بتوں اور بزرگوں کے خلاف اس نئے دین کی تبلیغ و اشاعت کو کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتے۔ یا تو تم اس کا سدِ باب کرو۔ ورنہ ہم نے ٹھان لی ہے کہ ہم دونوں فریقوں میں سے ایک ضرور ہلاک ہو جائے گا۔ اس دھمکی نے ابو طالب کو پریشان کر دیا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ قریش اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں۔ جو جی میں ٹھان لیتے ہیں اُسے کر گزرتے ہیں۔ ابو طالب نے آپ کو بلوایا اور بڑے دردانگیز لہجے میں کہا "جانِ عم!

اتنا بوجھ مجھ پر نہ ڈالو، جسے میں برداشت نہ کرسکوں"۔ اس پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال کیا کہ میرے چچا اب میری مدد اور حمایت نہیں کرسکتے۔ اس ذمّے داری سے دست کش ہونا چاہتے ہیں۔ آپؐ نے جواب دیا:

"اے میرے چچا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لاکر رکھ دیں۔ تب بھی میں اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا، یہاں تک کہ خُدا اسے پُورا کردے یا میں خود اس کوشش میں ہلاک ہوجاؤں"۔

یہ کہتے کہتے حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہاں سے اُٹھ کر چلے ہی تھے کہ ابُوطالب نے آواز دی: "اے بھتیجے! ادھر آؤ"۔ حضورؐ واپس آئے تو ابُوطالب نے کہا: "تمھارا جو جی چاہے کرو، مَیں ہرگز تمھارا ساتھ نہ چھوڑوں گا"۔

قریش پر یہ بات جب اچھی طرح واضح ہوگئی کہ ابُوطالب محبت و شفقت کے سبب محمدؐ ابن عبداللہ کی حمایت و مدد کر رہے ہیں تو وہ ایک خوب صورت نوجوان عمارہ بن مُغیرہ کو لے کر ابُوطالب کے پاس آئے اور یہ پیش کش کی کہ تم اس لڑکے کو اپنا فرزند بنا لو اور اپنے بھتیجے محمدؐ کو ہمارے حوالے کردو۔ اس پر ابُوطالب نے کہا "کیا خوب مشورہ ہے کہ میں اپنے فرزند کو تو تمھارے ہاتھوں ہلاک ہونے کو چھوڑ دوں اور تمھارے لڑکے کی پرورش اپنے ذمّے لُوں"۔ ابُوطالب کی زبان سے یہ گفتگو سن کر کفار اپنا سا منہ لے کر واپس چلے گئے۔

جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے صحابہؓ پر کفار کے یہ بے انتہا ظلم و

ستم نہ دیکھے گئے تو آپؐ نے انھیں حبشہ ہجرت کرنے کا مشورہ دیا۔ آپؐ کی اجازت سے ۱۱ مرد اور ۴ عورتیں، کل پندرہ افراد کا قافلہ مکے میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر حبشہ کو روانہ ہو گیا۔ ان میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ حضرت رقیہؓ بنتِ رسولؐ بھی شامل تھیں۔ جب کفار کو صحابہؓ کی اس مختصر سی جماعت کی ہجرت کا پتہ چلا تو انھوں نے ان ستم رسیدوں کا پیچھا کیا، لیکن مہاجرین بہت دور نکل چکے تھے۔ کافروں کا تعاقب ناکام رہا۔ اس ناکامی پر ان کینہ پروروں نے بہت کچھ پیچ و تاب کھایا۔ آخر انھوں نے ایک وفد اس غرض کے لیے تیار کیا کہ وہ تحفے تحائف لے کر حبشہ جائے اور وہاں کے بادشاہ سے مل کر کہے کہ ان مہاجرین کو ملکِ حبشہ کے حدود سے نکل جانے کا حکم دیا جائے تاکہ ان لوگوں کو مجبوراً مکے واپس آنا پڑے ——— اور ——— پھر ان پر وہی ظلم و ستم کریں۔

اس وفد نے شاہِ حبش کے دربار میں حاضر ہو کر عرض کیا :

”اے بادشاہ! ہمارے شہر کے چند سرپھرے اور فتنہ پرداز اپنے آبائی دین سے برگشتہ ہو کر آپ کی مملکت میں آگئے ہیں۔ اگر وہ آپ کا اختیار کردہ مذہب ہی قبول کر لیتے تو بھی غنیمت تھا، لیکن انھوں نے ایسا بھی نہیں کیا۔ انھوں نے تو ایک ایسا مذہب ایجاد کیا ہے جس کے سمجھنے سے ہم اور آپ دونوں قاصر ہیں۔ اے شہنشاہِ عظمت مدار! قریشِ مکہ کے اصحابِ رائے اور شیوخ نے آپ کے حضور ان لوگوں کو واپس لے جانے کے لیے ہمیں بھیجا ہے۔“

کفارِ قریش کے اس وفد کی عرضداشت سن کر بادشاہ نے مہاجرین کو دربار میں

طلب کیا اور اُن سے کہا کہ تم اِن لوگوں کے جواب میں کیا کہنا چاہتے ہو۔ حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بڑے بھائی) بادشاہ کے استفسار پر کھڑے ہُوئے اور فرمایا :

"اَے بادشاہ! ہم لوگ دَورِ جہالت کی یادگار ہیں، جن کے باپ دادا بُتوں کی پرستش کرتے تھے، جن کی خوراک مردہ جانوروں کا گوشت تھا۔ وہ لوگ زناکاری، قماربازی اور ہر قسم کی بدکاری میں مبتلا تھے صِلۂ رحمی، ہمدردی اور انسانیت سے کوسوں دور تھے۔ ان میں سے ہر شخص کمزور کا مال دبا لینے اور اُسے ایذا دینے کا عادی تھا۔ لُوٹ مار، قتل و غارت اُن کا شیوہ تھا۔ وہ لوگ صدیوں سے اسی نہج پر زندگی بسر کر رہے تھے کہ یکایک رحمتِ الٰہی کا نزول ہُوا۔ اللہ تعالیٰ نے اِن سرکشوں ہی میں سے ایک ایسے شخص کو نبوّت و رسالت کے منصب پر مامور کیا، جسے اُس کی قوم "امین" کا لقب دے چکی تھی، جس کی پاک دامنی، ذاتی شرافت اور خاندانی نجابت سے سب لوگ واقف تھے۔ اُس نے ہمیں خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی دعوت دی تو ہم نے اُس کی آواز پر لبّیک کہا۔ اپنے باپ دادا کے مذہب، بُت پرستی کو چھوڑ کر ایک اللہ کی عبادت کا عہد و اقرار کیا۔ اُس نے ہمیں راست بازی، دیانت و امانت، صلۂ رحمی، ہمدردی، عدل و انصاف اور تمام انسانوں سے محبّت کرنے کا سبق پڑھایا۔ ہم نے اُس کا کہا مانا، اُس نے کہا بلا وجہ کسی کو قتل نہ کرو۔ کسی کا مال غصب نہ کرو۔ کسی کو

ایذا مت پہنچاؤ، کسی کی تذلیل نہ کرو۔ ہم نے ان سب باتوں سے ہاتھ
روک لیا۔ جھوٹ، فریب، عیاری، مکاری اور دغابازی کو اُس نے
بدترین بُرائی قرار دیا۔ ہم نے ان برائیوں سے توبہ کی۔ اُس نے ہمیں
پاک دامن عورتوں پر بہتان لگانے سے منع کیا۔ ہم نے اپنی زبان پر مُہر
لگالی۔ اُس نے کہا یتیموں کا ناجائز مال کھانا اور چوری کرنا حرام ہے۔
ہم نے ایسے مال سے پرہیز کیا۔ ہم نے اِن احکام کے آگے سر جھکا دیا۔
اُس نے ہمیں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے اللہ تعالیٰ سے ڈرنا
اور اُس کے احکام پر عمل کرنا اختیار کر لیا۔"

اِسی انداز میں اِسلامی تعلیمات کا تذکرہ کرنے کے بعد حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ
عنہ نے کہا :۔

"اَے بادشاہ! ہم نے اس رسولؐ کی تصدیق کی، اس پر ایمان لائے
اور اُس نے ہمیں جو کچھ حکم دیا اُسے بجالائے۔ جس کے سبب ہماری
زندگیوں میں ایک عظیمُ الشّان پاکیزہ اِنقلاب پیدا ہوگیا۔ ہم نے تمام
بُرائیوں اور بدکاریوں سے توبہ کر کے نیکی اور راستی کی زندگی شروع
کر دی، جس پر ہمارے ہم وطن ہم سے ناراض ہوگئے اور ہمیں ایسی
ایسی اِیذائیں دیں، جن کے تصوّر سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ اِن لوگوں
نے ہمیں محض اس لیے ستایا کہ ہم نے سچا دین کیوں اختیار کیا۔ یہ لوگ
چاہتے ہیں کہ ہم اسلام ترک کر کے پھر ان کی طرح بُت پرستی کرنے

لگیں اور شرم و حیا، نیکوکاری اور راست بازی کا دامن چھوڑ کر پھر فسق و فجور میں مبتلا ہو جائیں لیکن نہ ہم اپنے رسولؐ کی تعلیم سے دستکش ہوئے اور نہ ان لوگوں نے ہمارا پیچھا چھوڑا۔ اب یہ لوگ ہماری جانوں کے دشمن بن گئے ہیں۔ جب ان کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا اور ہمارا جینا دوبھر ہو گیا تو مجبور ہو کر ہم نے اپنے وطنِ عزیز کو خیرباد کہا اور ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اور جب ہم نے اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑائی تو آپ کے سوا ہمیں کوئی انسان دوست اور انصاف پسند بادشاہ نظر نہ آیا۔ ہم اپنے وطن سے ہجرت کر کے آپ کی سلطنت میں پناہ لینے آئے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کریں گے اور ہم پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

یہ تھا اُس نبیِ اُمّی کے مکتب کا فیض، جس نے دُنیا کے کسی معلم اور اُستاد کے آگے زانوے ادب تہ نہیں کیا تھا کہ ایک صحرانشین جسے کبھی کسی بادشاہ کے دربار میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا اور جو شاہی درباروں کے آداب سفارت و گفتگو سے بھی واقف نہ تھا۔ بادشاہ کے دریافت کرنے پر کسی مہلت کے بغیر کس مؤثر انداز میں اپنا مقدمہ پیش کرتا ہے۔ اس کی تقریر فنِ خطابت کے اصُول کے اعتبار سے کتنی جامع، پُرمغز، مُدلّل اور اثر انگیز ہے۔ شاہِ حبش اس تقریر کو سُن کر اس قدر مُتاثر ہُوا کہ اُس نے مہاجرین کو واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کُفارِ مکہ کے پیش کیے ہُوئے تحفے واپس کرتے ہُوئے کہا کہ اللہ نے مجھے یہ سلطنت رشوت لے کر عنایت نہیں کی

پھر میں کسی سے کیوں رشوت لوں۔ اور وفد کو واپس جانے کا حکم دیا۔ جب یہ وفد مکے واپس پہنچا اور اپنی ناکامی اور پشیمانی کی داستان اس نے سنائی تو کفارِ مکہ غصے کے مارے دانت پیسنے لگے۔ مسلمانوں کو جب اس وفد کے ناکام اور بے نیلِ مرام واپس آنے کی اطلاع ملی تو دوسرے سال بہت سے مسلمانوں نے ہجرت کی اور بچوں کے علاوہ سو سے زائد افراد حبشہ میں جاکر آباد ہوگئے۔ معراج کا مشہور واقعہ اسی زمانے میں پیش آیا اور اسی سال جب کہ نبوت کا چھٹا سال تھا، حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ مشرف بہ اسلام ہوئے اور اسی دن سے نماز باجماعت ادا کی جانے لگی۔

کفارِ مکہ نے پہلے تو ابوطالب سے گفتگو، شکایت اور داد فریاد کی تھی۔ اب سردارانِ قریش نے اکٹھے ہوکر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور آپؐ سے اس طرح خطاب کیا:

"اے محمدؐ! ہم نے تم کو گفتگو کرنے کے لیے بلایا ہے کیونکہ خدا کی قسم! ہم عربوں میں سے کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے، جس نے تمھاری طرح اپنی قوم کو مصیبت میں مبتلا کیا ہو۔ تم نے ہماری جماعت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں اور ہمیں پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ اس ہنگامہ آرائی سے اگر تمھارا مطلب دولت حاصل کرنا ہے تو تم ہمیں بتاؤ۔ ہم تمھارے لیے اس قدر مال و دولت مہیا کریں گے کہ تم سب سے بڑے امیر و دولت مند ہو جاؤ گے۔ اگر تمھیں سرداری اور حاکم بننے کی تمنا ہے تو ہم تم کو اپنا سردار بنائے

لیتے ہیں۔ اگر تم عرب کی کسی حسین خاتون سے شادی کرنے کے خواہش مند ہو تو اس کا نام ہمیں بتاؤ۔ ہم اسے تمھاری رفیقۂ حیات بنا دیں گے اور یہ جو تمھارے پاس کوئی قاصد بن کر آتا ہے، اگر جن یا آسیب ہے تو ہم کو آگاہ کر دو۔ عرب کے بہترین کاہنوں، طبیبوں اور جھاڑ پھونک کرنے والوں سے تمھارا عِلاج معالجہ کرائیں گے۔"

کتنی عظیم الشان پیش کش تھی۔ کتنا بڑا لالچ تھا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا:

"نہ میں مال و دولت جمع کرنا چاہتا ہوں، نہ سرداری اور بادشاہت کی تمنا ہے، نہ کسی عورت پر مائل ہوں، نہ بیمار ہوں، نہ آسیب زدہ ہوں۔ جس قدر باتیں تم نے کہی ہیں، ان میں سے ایک بھی مجھ میں نہیں ہے۔ مجھ کو تو اللہ تعالیٰ نے رسولؐ بنا کر بھیجا ہے اور اپنی کتاب مجھ پر نازل فرمائی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تمھارے لیے بشیر و نذیر بنوں۔ میں تمھیں اس کے عذاب سے ڈراؤں اور ثواب کی خوش خبری دوں۔ پس میں تمھیں اللہ کا پیغام پہنچاتا ہوں اور اس فرضِ منصبی کے بجالانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ اگر تم میرے پیغام کو قبول کرو گے تو دُنیا اور آخرت میں تمھارے لیے بھلائی ہے اور اگر قبول نہ کرو گے تو میں صبر کروں گا۔ جب تک اللہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ فرمائے۔"

یہ جواب سن کر کفارِ مکہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ وہ تو اس گمان میں تھے کہ ان کی پیش کش پر محمدؐ ابنِ عبداللہ خوش ہو کر اُن کے فریب میں آجائیں گے۔ دُنیا میں دولت، سرداری اور حُسن و جمال ہی کے لیے ساری تگ و دو اور جاں فشانیاں کی جاتی ہیں اور یہ سب کی سب ایک ہی وقت میں محمدؐ کے لیے مُہیا کیے جانے کا وعدہ کیا جا رہا تھا۔ مگر یہ تو عجیب و غریب شخص نکلا۔ اس نے تو ہماری ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ نہ جانے اس کے سامنے کون سا مقصد ہے، جس پر دنیا کی تمام مسرتوں اور عزتوں کو بے دریغ قربان کیا کیا جا رہا ہے۔

کفارِ مکہ جب ہر طرف سے مایوس ہو گئے اور ان کی ہر تدبیر ناکام ثابت ہوئی تو انھوں نے ایک نئے ظلم کا منصوبہ تیار کیا۔ وہ یہ کہ انھوں نے ایک عہد نامہ لکھ کر خانۂ کعبہ میں لٹکا دیا، جس میں تحریر تھا کہ :-

"محمدؐ ابنِ عبداللہ کے قبیلے سے کوئی رشتہ ناطہ اور کسی قسم کا لین دین نہ کرے۔ نہ کھانے پینے کی چیزیں اُن کے ہاتھ فروخت کرے نہ اُن سے بولے چالے تاوقتیکہ محمدؐ قتل کے لیے اُن کے حوالے نہ کر دیے جائیں۔"

یہ ایک انتہائی سخت قسم کا مکمل طور پر سماجی مقاطعہ تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قبیلے کے افراد شعبِ ابی طالب (مکّے کے قریب ایک گھاٹی) میں چلے گئے اور تین سال تک وہیں رہے۔ یہ دور مسلمانوں پر بڑا سخت گزرا۔ کئی کئی دن کھانے کو کوئی چیز نہ ملتی، مسلسل فاقے، بھوک سے بچے بھوک کے مارے بلکتے اور

اُن کے رونے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایامِ حج میں باہر تشریف لاتے اور تبلیغ فرماتے۔ آخر قریش کے چند رحم دِل افراد نے ان مظالم کو مزید مدت تک قائم رکھنے کی مخالفت کی اور یہ مقاطعہ ختم ہو گیا۔

عیش پرستوں اور اقتدار پرستوں کا یہ خاصّہ ہے کہ وہ اسی تحریک کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، جو تحریک ان کے اقتدار کے قائم رکھنے میں معاون و مددگار ہو۔ لیکن جب بھی کوئی ایسی تحریک چلی ہے، جس سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچتا ہو جس کا مقصد رفاہ عام ہو، لیکن چند صاحبانِ اقتدار کے منصب اور جاہ و حشمت کو اس سے ذرا سی بھی ٹھیس لگتی ہو تو وہ اس قسم کی تحریک پر مُلک و قوم کی غداری کی تہمت لگا کر اسے کچل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ظلم و تشدد سے کام نہیں نکلتا تو انعام و اکرام کا لالچ دیتے ہیں۔ یہ حربہ بھی ناکام رہتا ہے تو مکر و فریب کے دام بچھاتے ہیں اور طرح طرح کی شاطرانہ چالیں چلتے ہیں۔ چنانچہ کفارِ قریش نے بھی آخری تدبیرِ مصالحت کی یہ سوچی کہ وہ ابُوطالب کے پاس ایسی حالت میں گئے، جب وہ بسترِ مرگ پر پڑے تھے۔ ان سے کہا کہ تم اپنی زندگی میں اپنے بھتیجے سے ہمارے لیے عہد لے لو کہ وہ ہمارے دین سے اور ہم اس کے دین سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے۔ ابُوطالب نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بلوایا اور کفارِ مکہ کی یہ شرط پیش کی، اس کے جواب میں جو کچھ حضورؐ نے فرمایا، اُس کا مفہوم یہ ہے کہ: "اے چچا! بہتر ہے کہ یہ میری صرف ایک بات مان لیں"۔ ابھی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ ابُوجہل جھٹ سے بیچ میں بول پڑا۔ اُس نے کہا "ہاں! ہاں! ایک کیا، ہم تمہاری دس باتیں ماننے کے لیے تیار ہیں"۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا " اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

کا سچے دل سے اقرار کرلو اور خُدا کے سوا تمام معبودانِ باطل کو چھوڑ دو۔ جس کے بعد تم تمام عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم پر فوقیت حاصل ہو جائے گی"۔ کفارِ مکہ، جن کے دِل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے تھے۔ وہ قبولِ حق کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ حضورؐ کی اِس تجویز کو اُنھوں نے رد کر دیا۔ خدا کی وحدانیت گویا ان کی چڑ تھی۔

ابوطالب اور بی بی خدیجہؓ کا انتقال

نبوّت کا دسواں سال تھا، شعب ابی طالب سے نکلے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ آپ کے غم خوار چچا ابُوطالب کا انتقال ہو گیا اور اب آپؐ کی پشت پناہی اور ہمدردی کرنے والا کوئی نہ رہا۔ اسی سال چند ہفتے بعد آپؐ کی رفیقۂ حیات حضرت خدیجۃؓ الکبریٰ نے وفات پائی۔ آپؓ ۲۵ سال تک حضورؐ کی شریکِ حیات رہیں۔ آپؓ کے بطن سے دو بیٹے اور چار لڑکیاں تھیں۔ لڑکے تو کم سنی ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لڑکیاں زندہ رہیں، لیکن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے وقت صرف حضرت فاطمۃُ الزہراؓ حیات تھیں۔ حضورؐ کو پے در پے دو صدمے اُٹھانا پڑے۔ اِس سال کو صحابہؓ عام الحزن (YEAR OF SORROW) کہا کرتے تھے۔ اِن دو مُسلسل سانحوں کا حضورؐ کو بہت غم ہُوا اور کفارِ مکہ کے حوصلے بڑھے۔

طائف میں تبلیغ

طائف، مکّے سے تقریباً ۶۰ میل پر ایک مشہور بستی ہے۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم وہاں اسلام کی تبلیغ کے لیے تشریف لے گئے۔ حضورؐ کے ہمراہ آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بھی تھے۔ اہلِ طائف نے رحمۃٌ للعالمینؐ سے بڑی سنگ دِلی کا برتاؤ کیا۔ اُنھوں نے دعوتِ حق کو صرف رُد کر دینے ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ آوارہ لڑکوں اور غُلاموں کو حضورؐ کے پیچھے لگا دیا، جو آوازے کستے، مذاق اُڑاتے اور اینٹ

پتھر پھینکتے تھے۔ یہاں تک کہ حضورؐ کے پائے مبارک خون آلود ہو گئے اور آپؐ کے موزے خون سے بھر گئے۔ حضورؐ زخموں سے چور ایک باغ میں تشریف لائے اور وہاں انگور کی بیلوں کے سایے میں بیٹھ کر دعا فرمائی (مفہوم) :

"اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں اپنے ضعفِ قوت، ناچاری، بے چارگی اور لوگوں کی ایذا دہی کی شکایت کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو ہی کمزوروں اور بے کسوں کا محافظ اور نگہبان ہے اور تو ہی میرا دستگیر اور فریاد رس ہے۔ کیا تو مجھے ان لوگوں کے حوالے کر دے گا جو میرے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔ اگر تو مجھ سے راضی ہے تو پھر مجھے کسی کی پروا نہیں۔ تیری رحمت بڑی وسیع ہے۔ میں تیرے اس نور کے وسیلے سے جس سے تو نے ظلمت کو روشن کیا ہے، تیرے غضب سے پناہ مانگتا ہوں۔ اگر تیری توفیق شامل حال نہ ہو تو میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکہ تشریف لائے تو کفار مکہ کی دشمنی اور بڑھ گئی۔ حضورؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کو پہلے سے بڑھ چڑھ کر ایذائیں دی گئیں ایک ایک کافر دعوتِ اسلام کی راہ میں سنگین رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ انھیں سب سے زیادہ جھنجلاہٹ اس بات پر تھی کہ اتنی دردناک اذیتوں اور جان لیوا مخالفتوں کے باوجود اسلام کا کام بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ کوئی مسلمان ہمت نہیں ہارتا اور کمزوری نہیں دکھاتا۔ اس خطرناک ماحول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقع پر

آنے والے قبائل کا دَورہ فرماتے اور اُنھیں اسلام کی خُوبیاں سمجھاتے۔

نبوّت کا گیارھواں سال تھا۔ حج کے موقع پر یثرب (مدینے) کے مشہور قبیلے خزرج کے چھ آدمی مکّے آئے۔ حضورؐ نے ایک گھاٹی میں جاکر اُنھیں اسلام کی دعوت دی۔ قرآن پڑھ کر سُنایا، نیکی کی ہدایت کی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہُوا کہ وہ حق پسند لوگ مشرف بہ ایمان ہو گئے اور یثرب (مدینے) جاکر اُنھوں نے وہاں کے لوگوں سے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے مِلنے، حضورؐ کی دعوت دینے اور اپنے اِسلام لانے کا ماجرا بیان کیا۔ اِس کے بعد یثرب (مدینے) کے لوگوں میں اِسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں چرچے اور تذکرے ہونے لگے۔ دوسرے سال یعنی بارہ نبوی میں یثرب (مدینے) کے بارہ آدمی حج کے زمانے میں مکّے آئے اور یہاں آکر حضورؐ کے دستِ مبارک پر اِسلام قبول کیا۔ جب یہ لوگ مکّے سے یثرب جانے لگے تو حضورؐ نے اُن سے ان باتوں پر بیعت لی کہ شرک، چوری، زِنا، قتلِ اَولاد کا اِرتکاب نہیں کریں گے اور نیکی کے کاموں میں حضورؐ کی اِطاعت کیا کریں گے۔ آپؐ نے ایک صحابیؓ کو ان نئے مُسلمانوں کو دینی تعلیم دینے کے لیے ان کے ساتھ کر دیا۔ جنھوں نے یثرب (مدینے) پُہنچ کر اس قدر اخلاص، سوز و دَرد اور جاں فشانی کے ساتھ اِسلام کی تبلیغ کی کہ انصارِ یثرب (مدینہ) کے گھر گھر میں اِسلام کی روشنی پُہنچ گئی۔ اُدھر مکّے میں کفار کا یہ حال کہ دعوتِ حق کو فنا کرنے اور بیخ و بُن سے اُکھاڑنے کے درپے تھے۔ صحابۂ کرامؓ پر روز بروز سختیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ اِدھر یثرب (مدینے) میں یہاں کے حق پسند باشندوں کا یہ رنگ کہ اسلام اور ایمان کے لیے دِلوں کے دریچے کھلے چلے جا رہے تھے۔

نبوّت کا تیرھواں سال تھا کہ یثرب (مدینے) سے بہتّر آدمی جو مُسلمان ہو چکے تھے، مکّے آئے۔ آپؐ کے چچا حضرت عبّاسؓ جو ابھی تک مسلمان نہیں ہُوئے تھے، ان کی زبانی ان کو معلوم ہوا کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا کچھ ایسا ارادہ ہے کہ مکّہ چھوڑ کر یثرب (مدینے) چلے جائیں۔ اس اطلاع کے بعد خدا کے نیک بندوں نے حضورؐ سے عرض کیا۔ یارسُولؐ اللہ! آپ کو جو کچھ فرمانا ہو فرمائیں اور جیسا عہد بھی ہم سے لینا چاہیں لے لیں۔ ہم ہر طرح آپؐ کی مدد کرنے اور ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔ اس پر حضورؐ نے قرآنِ کریم کی آیات انھیں پڑھ کر سُنائیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب انھیں راغب اور متوجّہ کیا۔ پھر فرمایا کہ میں تم سے اس کی بَیعت لیتا ہوں کہ تم اپنی اولاد کی طرح میری حمایت کرو گے۔ یہ سُنتے ہی اُن کے سردار نے حضورؐ کے مبارک ہاتھ کو تھاما اور عرض کیا "اُس خدا کی قسم! جس نے آپؐ کو دینِ حق دے کے بھیجا ہے، ہم آپؐ کی ایسی ہی حمایت کریں گے جیسی اپنی اولاد کی کرتے ہیں۔" ان کا یہ جواب سُن کر حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "جس سے تم لڑو گے، اُس سے مَیں بھی لڑوں گا۔ جس سے تم صلح کرو گے، اس سے مَیں بھی صُلح کروں گا۔ تمھارا ذِمّہ، میرا ذِمّہ اور تمھاری حُرمت میری حرمت ہوگی۔ میرا جینا اور مرنا تمھارے ہی ساتھ ہو گا۔" اس عہد و پیمان کے بعد یہ لوگ خوشی خوشی یثرب (مدینے) واپس چلے گئے۔

ہجرت

نبوت کا تیرھواں سال تھا کہ ہجرت کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی اطلاع دی۔ اس حکم اور اجازت کے ملتے ہی صحابۂ کرامؓ اپنا مال و اسباب گھربار، جائداد، تجارت، کاروبار غرض اللہ اور رسولؐ کے فرمان کی اطاعت میں سب کچھ چھوڑ کر یثرب (مدینے) روانہ ہو گئے اور ڈیڑھ دو مہینے کے اندر اندر تمام صحابہؓ ایک ایک دو دو کر کے یثرب (مدینے) پہنچ گئے۔ کوئی شک نہیں، وطن کی سرزمین بڑی کشش رکھتی ہے اور وطن کی محبت بڑی جان دار ہوتی ہے مگر اللہ اور رسولؐ کے حکم کے مقابلے میں ہر کشش، ہر تعلق اور ہر محبت ہیچ ہے۔ صحابہؓ کا یہی عقیدہ تھا۔ اسی پر عمل تھا اور یہی کردار وہ رکھتے تھے۔

اس عرصے میں مکہ مسلمانوں سے تقریباً خالی ہو گیا۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے۔ کفارِ مکہ نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان تمام دُنیاوی ساز و سامان اور مال و دولت چھوڑ کر ہجرت کر گئے ہیں اور یثرب (مدینے) پہنچ کر انھیں فراغت و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع مل جائے گا تو ان

شیوخ اور سرداروں نے جلسہ منعقد کر کے یہ فیصلہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو اپنے بستر پر سوتے ہوں تو آپ کو گھیرے میں لے لیں اور بیدار ہونے پر قبیلوں کے تمام سردار بہ یک وقت اپنی تلواروں سے حملہ کر دیں تاکہ محمدؐ ابن عبداللہ کا خون تمام قبیلوں میں بٹ جائے اور بنو ہاشم اتنے بہت سے قبائل سے قصاص لینے کی جرأت اور مطالبہ نہ کر سکیں۔ تجویز بہ ظاہر بڑی مدبرانہ تھی، مگر جس کو اللہ رکھے اُسے کون چکھے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سازش کی جب اطلاع ہوئی تو حضورؐ نے اہلِ مکہ کی امانتیں حضرت علیؓ کے حوالے کیں کہ میرے یہاں سے جانے کے بعد لوگوں کو ان کی امانتیں واپس کر دینا۔ کفارِ مکہ کے کردار کا یہ بھی ایک عجوبہ ہے کہ اتنی شدید مخالفتوں کے باوجود اپنی امانتیں حضورؐ ہی کے پاس رکھتے تھے۔ حضورؐ کی دیانت سب کے نزدیک مسلم تھی۔ کفار اتنا نہیں سوچتے تھے کہ جو شخص بندوں کی امانت میں خیانت نہیں کرتا، وہ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں جھوٹ کس طرح بول سکتا ہے۔

حضورؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹایا۔ اپنی چادر ان کو اُڑھائی اور خود اللہ کا نام لے کر باہر نکلے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ فرمایا مجھے ہجرت کا حکم مل گیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کے لیے پہلے ہی تیاری کر لی تھی۔ اس خبر کو سن کر ان کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلکنے لگے۔ حضورؐ، ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر یثرب (مدینے) کی طرف روانہ ہوئے۔ کفار جو تلواریں لیے ہوئے حضورؐ کے قتل کے ارادے سے رات بھر جاگتے رہے تھے۔ صبح نمودار ہونے پر جب اُنھوں نے دیکھا

کہ محمدؐ بن عبداللہ کے بستر سے علیؓ ابن ابی طالب اُٹھے تو یہ لوگ خِفت، شرمساری اور جھنجھلاہٹ لیے ہوئے اپنے گھروں کو ناکام و نامراد واپس ہوئے اور حضورؐ کی تلاش شروع کردی۔ مکّے کے چاروں طرف تعاقب کیا گیا۔ مشہور راستوں اور عام گزرگاہوں پر تلاش شروع کردی۔

رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم، غارِ ثور میں، جو مکے سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہے، اپنے یارِ غار ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ تین دن مقیم رہے۔ ایک دن تعاقب کرنے والا گروہ غار کے ٹھیک دہانے پر جا پہنچا۔ ان کے پیروں کی چاپ اور باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ حضرت ابوبکرؓ نے مضطرب ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں عرض کیا کہ "ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟ اتنا بڑا گروہ اور ہم صرف دو۔ اِس پر حضورؐ نے معاً فرمایا "نہیں، ہم تین ہیں۔ اللہ بھی ہمارے ساتھ ہے"۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس اضطراب اور پریشانی کا اظہار اپنے لیے نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حفاظت کی خاطر کیا تھا۔ ان تین دنوں میں حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کھانا پانی بھجوائیں اور ان کا غلام بکریاں چراتے ہوئے شام کے وقت غار پر پہنچ جاتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت ابوبکرؓ کے لیے دودھ مہیا کرتا۔ ساتھ ہی کافروں کی نقل و حرکت کی اطلاع بھی دے جاتا۔ تین دن غار میں رہنے کے بعد حضورؐ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے غلام کو ساتھ لے کے یثرب (مدینے) کی طرف روانہ ہوئے۔

حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کی اونٹنی پر سوار ہونے سے پیشتر ابوبکر صدیقؓ سے

اُس کی قیمت طے کرائی۔

کفارِ مکہ نے بہت کچھ دوڑ دھوپ کی، مگر ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ جب اُنھیں یقین ہو گیا کہ حضورؐ اُن کی گرفت سے نکل گئے تو اُنھوں نے حضورؐ کی گرفتاری کے لیے سو اُونٹ انعام میں دینے کا اعلان کیا۔ دو چار نہیں، سو اُونٹوں کا اعلان! ایک عرب کے لیے اس سے بڑا لالچ اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایک شخص سراقہ نامی جو بڑا شہسوار تھا، اس اعلان کی شہرت سُن کر حضورؐ کے تعاقب میں یثرب (مدینے) کی سمت روانہ ہو گیا۔ مکے سے تھوڑی ہی دُور پہنچا تھا کہ اُس کے گھوڑے نے ایکا ایکی ٹھوکر کھائی اور وُہ زمین پر آ رہا۔ یہ اُس شخص کے لیے غیبی تنبیہ تھی، مگر وہ انعام کے لالچ میں تعاقب سے باز نہ آیا۔ یہاں تک کہ حضورؐ اُسے نظر آ گئے۔ وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا، مگر اللہ تعالیٰ جس کی حفاظت کرے، اُسے نقصان یا گزند کوئی نہیں پہنچا سکتا۔ اُس کا وہ گھوڑا جو تیز رفتار تھا۔ اُس کے پاؤں زمین میں دھنس گئے اور اُسے ناکام واپس جانا پڑا۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہِ ربیعُ الاوّل کی آٹھ تاریخ دوشنبہ کے روز دوپہر کے وقت قبا جو یثرب (مدینے) کے مضافات میں واقع ہے، پہنچے اور وہاں چند دن قیام فرمایا۔ اسی مقام پر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بھی لوگوں کی امانتیں واپس کر کے آپؐ سے آ ملے۔ یہاں قبا میں حضورؐ نے ایک مسجد تعمیر کرائی جو آج تک اہلِ ایمان کی زیارت گاہ ہے۔ مُسلمانوں کی تاریخ کا سال ہجرت سے اس لیے شرُوع ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بعد اسلام کی تاریخ کا ایسا دَور شرُوع ہوتا ہے جہاں فتح مندیاں اور کامرانیاں ہی ہر طرف نظر آتی ہیں۔ ہجرت اسلام کی ترقیِ اقتدار کا روشن دیباچہ ہے۔

یثرب (مدینے) میں یہ خوش خبری پہنچ چکی تھی کہ رحمۃ للعالمین تشریف لا رہے ہیں۔ اس بستی میں ہر طرف حضورؐ کی آمد آمد کی دھوم تھی۔ روزانہ صبح کے وقت لوگ حضورؐ کے خیر مقدم کے لیے قبا سے یثرب (مدینے) آنے والے راستے پر جمع ہو جاتے اور جب دھوپ تیز ہو جاتی اور کوئی آتا ہوا نظر نہ آتا تو گھروں کو دل گرفتہ اور ملول واپس ہوتے۔ آخر وہ مبارک دن بھی آگیا ـــــ کہ یہ خبر ملی کہ حضورؐ قبا سے کچھ دیر میں چلنے ہی والے ہیں۔ اہلِ یثرب (مدینہ) جوشِ مسرت سے بے تاب ہوئے جاتے تھے۔ بنو نجار خیر مقدم کے لیے اس شان سے آئے کہ اُن کے جسموں پر ہتھیار سجے ہوئے تھے۔ یثرب (مدینے) کی آبادی سے دور تک انصار راستے کے دونوں طرف صفیں باندھ کر دیدہ و دل بچھائے کھڑے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں دف بجا بجا کر خیر مقدم کے اشعار پڑھ رہی تھیں۔ حضورؐ جب یثرب (مدینے) میں داخل ہوئے ہیں تو حضرت ابوبکرؓ سر اقدس پر چادر کا سایہ کیے ہوئے تھے۔ ہر شخص کی یہی تمنا تھی کہ حضورؐ کی میزبانی کی سعادت اُسے نصیب ہو۔ حضورؐ نے لوگوں کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے فرمایا کہ اُونٹنی کی رسّی چھوڑ دو۔ یہ جہاں بیٹھ جائے گی، میں وہیں قیام کروں گا۔ چنانچہ یہ اُونٹنی بنو نجار کے محلے میں پہنچی اور جس جگہ اب مسجدِ نبوی کا دروازہ ہے وہاں بیٹھ گئی۔ یہ جگہ دو یتیم لڑکوں کی ملکیت تھی، جن کو اراضی کا معاوضہ ادا کر کے مسجد اور حضورؐ کی رہائش کے لیے حجرے تیار کرائے گئے۔ جب تک مسجدِ نبوی اور اُس کے ملحقہ حجروں کی تکمیل نہیں ہوئی حضورؐ کا قیام حضرت ابو ایوبؓ انصاری کے یہاں رہا۔

ہجرت سے قبل مدینے کا نام "یثرب" تھا۔ اب اس کا نام "مدینۃ النبی"

(نبیؐ کا شہر) پڑ گیا۔ جو مختصر ہو کر "مدینہ" رہ گیا۔ مدینے میں جب مسجد بننے لگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے معماروں اور مزدوروں کی طرح کام کیا۔ بنیادیں کھودتے، پتھر ڈھوتے، گارا بناتے اور اس مشقت کو اپنی روح کی غذا سمجھتے۔ یہ مسجد فطرت کی سادگی کا مکمل نمونہ تھی۔ مسجد کے ایک سرے پر سائبان کے نیچے چبوترہ تھا۔ یہاں وہ مسلمان رہتے تھے، جن کا کوئی گھر بار نہ تھا یہ "اہلِ صُفّہ" کہلاتے تھے۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی تعلیم حاصل کرتے اور وقتاً فوقتاً تبلیغِ اسلام کے لیے دوسرے مقامات پر جاتے رہتے۔ یوں تو تمام صحابہؓ کی زندگی بہت زیادہ سادہ تھی، مگر اصحابِ صُفّہ کی زندگیوں میں اور بھی زیادہ فقر و سادگی اور دنیاوی چیزوں سے بے نیازی اور بے تعلقی پائی جاتی تھی۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی سکونت اور اُن کی گزر بسر کے بارے میں سوچا، کیونکہ اُن میں دولت مند بھی تھے، جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر مدینے چلے آئے تھے۔ حضورؐ نے انصار و مہاجرین کے درمیان مواخاۃ کرائی۔ یعنی ایک مہاجر اور ایک انصار کو منتخب فرمایا اور اُن سے کہا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے بھائی ہو۔ یہ اخوت اس قدر پائیدار ثابت ہوئی کہ دو حقیقی بھائیوں میں بھی ایسا بھائی چارہ اور اخلاص نہیں دیکھا گیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے مہاجرین و انصار اور یہود کے درمیان گفت و شنید کی اور اس کے بعد ایک معاہدہ مرتب فرمایا جس کی اہم اور خاص شرطیں یہ تھیں:۔

(۱) ہر قبیلے کے مقدمات و معاملات انھیں کے قوانین و رواج کے مطابق

طے ہوں گے۔

(۲) اگر مدینے پر کوئی بیرونی دشمن حملہ آور ہوگا تو مسلمان اور یہودی مل کر مدافعت کریں گے۔

۳۔ مدینے کا کوئی فریق (مسلمان اور یہودی) کسی بیرونی قبیلے سے براہ راست معاہدہ کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔

۴۔ مدینے کے باہر کوئی جنگ ہوئی تو کسی کو اس میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

۵۔ مدینے کے تمام نزاعی امور کا آخری فیصلہ حضورؐ صادر فرمائیں گے۔

اس معاہدے کی رُو سے جدید سیاسی اصطلاح میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ مدینے میں دولتِ مشترکہ (COMMON-WEALTH) قائم ہوگئی اور مسلمانوں کو داخلی طور پر سکون و اطمینان میسر آگیا۔ مکے کا دور بڑی مظلومیت اور پریشانی کا دور تھا جہاں آزادی کے ساتھ نماز پڑھنا ہی دشوار تھا، مگر مدینے میں کسی روک ٹوک کے بغیر اذان و تکبیر کے ساتھ مسلمان باجماعت نماز ادا کرنے لگے۔

مدینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی کہ قبیلۂ خزرج کے سردار عبداللہ بن اُبی کو لوگ اپنا بادشاہ منتخب کرلیتے۔ لیکن اب مدینے کا تمام نظم و نسق حضورؐ کے ہاتھ میں تھا۔ عبداللہ بن اُبی جو اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا، اسلام، پیغمبرِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف چپکے چپکے منافقانہ کردار ادا کرنے میں مشغول ہوگیا اور جب تک یہ شخص زندہ رہا، اپنی اسی منافقانہ روش

پر قائم رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی ہجرت کے بعد کفارِ مکہ شروع شروع میں تو خوش اور مطمئن تھے، مگر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ مدینے میں تو اسلام خوب پھل پھول رہا ہے۔ مدینے کے لوگوں نے محمدؐ بن عبداللہ کو اپنا سردار تسلیم کر لیا ہے۔ مسلمان نہایت اطمینان سے مدینے والوں کے ساتھ مل کر عبادت کرتے ہیں، تو انھوں نے شدید انتقام انگیز برہمی کے عالم میں عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین کو اس مضمون کا ایک خط لکھا کہ اگر وہ حضورؐ کو مدینہ چھوڑنے پر مجبور نہیں کریں گے یا اہلِ مدینہ کفارِ مکہ کے ساتھ شامل ہو کر مسلمانوں سے جنگ نہیں کریں گے تو مکے کے کفار ایک لشکرِ جرار لے کر مدینے پر حملہ آور ہوں گے تمام مردوں کو تہِ تیغ کر دیا جائے گا۔ مال و متاع لوٹ لیا جائے گا۔ عورتیں لونڈیاں بنا لی جائیں گی۔ اس خط کے ملتے ہی عبداللہ بن اُبیؓ نے ایک خفیہ مشاورتی مجلس اپنے ہم خیالوں اور یہودیوں کی منعقد کی اور اس مجلس میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہماری بس اسی میں خیریت ہے کہ مسلمانوں کو جیسے بنے مدینے سے باہر نکال دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس سازش کی اطلاع ملی تو حضورؐ عبداللہ بن اُبیؓ کے پاس تشریف لے گئے اور اُس کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اہلِ نفاق کے اس سردار نے آپؐ سے منافقانہ انداز میں وعدہ کر لیا۔ زبان کچھ کہہ رہی تھی اور دل کچھ اور چاہ رہا تھا۔

اس عرصے میں قبیلہ اوس کا سردار سعد طوافِ کعبہ کے لیے مکے گیا تو ابوجہل نے اس کو ٹوکا کہ تم نے مکے آنے کی جرأت آخر کیسے کی، جب کہ تم مدینے والوں نے ہمارے سب سے بڑے دشمن محمدؐ کو پناہ دے رکھی ہے۔ سعد نے جواب دیا اگر آپ لوگوں کا یہی

رویہ رہا تو آپ کے قافلے جو اب تک امن و سلامتی کے ساتھ مدینے سے گزرتے رہے ہیں، آئندہ نہیں گزر سکیں گے اور نہ اُن کی حفاظت کی ذمّے داری مدینے کے باشندوں پر ہوگی۔ یہ سُن کر ابُوجہل اپنا سا مُنہ لے کر رہ گیا۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مسلمانوں کو محبت و اخوت کے رشتے میں پرو رہے تھے اور جو لوگ سالہا سال سے ایک دوسرے کے دشمن چلے آرہے تھے، ان کو متحد بنانے کی کوشش میں مصرُوف تھے کہ کفارِ مکہ کے مدینے پر چڑھائی کرنے کے لیے تیاری کی خبریں پہنچیں۔ حضور صلعم نے بھی اس متوقع حملے کے سدِ باب کے لیے مناسب تدبیریں اختیار کرنا شروع کر دیں۔ خاص طور سے مُسلمانوں کو صبر اور ثابت قدمی کی تلقین فرمائی۔ اب کوئی بات مُشتبہ اور پوشیدہ نہ رہی تھی۔ ہر بات کھل کر سامنے آگئی تھی۔ کفارِ مکہ نے مکے میں ہر طرح ظلم و ستم، جبر و زیادتی اور مکر و فریب کی تدبیریں کر کے دیکھ لیں۔ مگر اُن کو ہمیشہ ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

ایک طرف تو اہلِ مکّہ نے مدینے پر حملہ کرنے کی تیاریاں زور شور سے شرُوع کر دیں۔ دوسری طرف وہ عرب کے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کر رہے تھے۔ کُفارِ مکّہ کا جو تجارتی قافلہ بھی شام جاتا اور راستے میں جو قبائل بھی ملتے، اُن میں اسلام کے خلاف نفرت پھیلاتا۔ اس طرح اسلام کے خلاف عام فضا تیار کی جا رہی تھی۔ ہر قافلے کی حفاظت کے لیے مُسلح دستہ ساتھ ہوتا۔ تقریباً ایک سال کے بعد یعنی ہجرت کے دُوسرے سال جب کفارِ مکّہ نے مکمل تیاری کر لی تھی۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اطلاع ملی کہ ابُوسفیان قریش کا معزز و بااثر سردار اور میرِ قافلہ جو بہت سا سامان لے کر

شام میں ٹھیرا ہوا ہے۔ اُس نے مکے اطلاع بھیجی ہے کہ میرے قافلے کی واپسی پر اگر مسلمان چھیڑ چھاڑ اور مزاحمت کریں تو اُس کا سدِباب کر دینا ضروری ہے۔ حالانکہ اس وقت مسلمان ایسی حالت ہی میں نہ تھے کہ اس قسم کا کوئی اقدام کر سکتے۔ ابوسفیان کی طرف سے اطلاع ملنے پر مکے سے بہت سے مسلح افراد شام سے واپس آنے والے قافلے کی حفاظت اور مسلمانوں کی مفروضہ اور خیالی مزاحمت کا جواب دینے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ اِس عرصے میں کارواں مدینے کے علاقے سے خیریت کے ساتھ گزر چکا تھا۔ نہ اُسے کسی نے چھیڑا اور نہ اس کو کسی روک ٹوک سے سابقہ پڑا۔ ابوسفیانؓ امیرِ کارواں نے کفارِ مکہ کی اس فوج کو مشورہ دیا کہ وہ واپس چلے جائیں۔ لیکن اہلِ فوج اور خصوصاً ابوجہل نے اِس مشورے پر عمل کرنے سے اِنکار کر دیا اور وہ مدینے کی طرف برابر بڑھتے رہے، کیونکہ اُن کا مقصد تو کسی نہ کسی بہانے سے اِسلام کو کچل دینا تھا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو جب یہ اطلاع ملی کہ کفارِ مکہ مسلح ہو کر مدینے کی طرف آ رہے ہیں اور اُن کی نیتیں فاسد ہیں تو حضورؐ نے فوراً انصار و مہاجرین کو مشورے کے لیے جمع کیا۔ کیونکہ مشورہ قوم کی اجتماعی زندگی کی رُوح ہے اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا حضورؐ کی عادتِ مبارکہ میں داخل تھا۔ یہاں تک کہ آپؐ بعض معاملات میں اپنے اہل و عیال سے بھی مشورہ کرتے۔ صحابہؓ سے مشورے کے بعد یہ طے ہُوا کہ خطرے کی مدافعت ضروری ہے۔ کفارِ مکہ کی دشمنی اور سنگدلی کا مکے میں اُنھیں تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ چنانچہ انصار و مہاجرین کے تین سَو تیرہ افراد اکٹھے ہوئے۔ یہ مختصر سی دفاعی جماعت تھی، جو فوج نہیں کہلائی جا سکتی۔ ان کے پاس دو گھوڑے اور گنتی کے چند اُونٹ تھے۔ اِسی

نسبت سے سامان حرب بھی بہت کم تھا، مگر یہ وہ مقدس اور مخلص انسان تھے جو اپنی جانیں اللہ کے ہاتھ بیچ چکے تھے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ملت کی بہتری کے لیے جب تک افراد بخوشی قربانی دینے کے لیے تیار نہ ہوں، قوم نہیں بن سکتی اور بن چکی ہو تو قائم نہیں رہ سکتی۔ اُن کے پیش نظر رضائے الٰہی تھی اور یہی جذبہ اُن کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ تلواریں کُند ہو سکتی ہیں اور نیزے ٹُوٹ سکتے ہیں، مگر یہ جذبہ شکست و ریخت کو قبول نہیں کر سکتا۔

اِس طرف یہ مٹھی بھر مسلمان، دوسری طرف کفارِ مکہ کے ایک ہزار آزمُودہ کار سپاہیوں کا آلاتِ حرب سے مسلح لشکر! وُہ سواریوں، ہتھیاروں اور رسد غرض ہر چیز کا مکمل انتظام کر کے آئے تھے۔ بدر کے مقام پر جو مدینے سے ساٹھ میل پر واقع ہے۔ جنگ شروع ہوتی ہے۔ یہ معرکہ جو بلاشبہ حق و باطل کا معرکہ تھا۔ دُنیا کی ساری جنگوں سے مُختلف اور عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ ایک طرف ساز و سامانِ جنگ اور آلاتِ حرب سے مسلح کثیر گروہ ہے۔ یہ لوگ اِسلام کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھ کر مکے سے مدینے کی طرف روانہ ہُوئے تھے۔ ان کا سِپہ سالار اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی تلقین کر رہا تھا۔ دُوسری طرف اللہ والوں کی مختصر سی دفاعی جماعت تھی۔ جس نے اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اپنی جانوں کی بازی لگا رکھی تھی اور اللہ کے یہ نیک بندے جنگ کے مَیدان میں بھی عبادت سے غافل نہ تھے۔ یہاں تلواروں کے سائے میں بھی نمازیں پڑھی جا رہی تھیں اور اِن کے سپہ سالار نے تو میدانِ جنگ میں گویا اخلاقیات کی درسگاہ کھول رکھی تھی۔ مسلمانوں کو تاکید کے ساتھ سبق دیا جا رہا تھا۔۔۔۔ دیکھو!

"میدانِ جنگ میں حملے کی پہل تم نہ کرنا۔ ذاتی دشمنی کا انتقامی جذبہ پیدا نہ ہونے دینا۔ جو جنگ میں حصّہ نہ لیں۔ اُن پر ہتھیار نہ اُٹھانا۔ بُوڑھوں، عورتوں اور بچّوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا۔"

اس بے سروسامان جماعت کے سینوں میں جوشِ شہادت بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے اللہ پر بھروسا کیے ہوئے صف آرا تھے کہ کفار نے حملے کا آغاز کیا۔ مسلمانوں کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا اور لڑائی چھڑ گئی۔ تلواریں، نیزے، تیر کمان اور حربے غرض تمام ہتھیار حرکت میں آ گئے۔ مہاجرین کی جاں بازی، اخلاص اور بے نفسی و للّٰہیت کا یہ عالم تھا کہ بھائی کے مقابلے میں بھائی اور بیٹے کے سامنے باپ، دو بدو تلوار چلا رہے تھے اور اسلامی فوج کا مقدّس قائد اور انسانیت کا محسنِ اعظم اللہ کے حضور خاک پر سجدے میں سر رکھے ہوئے دُعا کر رہا تھا:۔

"اے اللہ! اگر آج یہ مختصر سی جماعت ہلاک ہو گئی تو پھر قیامت تک تیری پرستش نہ ہو سکے گی اور تیری عبادت کرنے والا اور تیری وحدانیت کی دعوت دینے والا کوئی نہ رہے گا۔ اے مولا! اپنے نام لیواؤں کی مدد فرما اور انھیں فتح و نصرت عطا فرما۔"

دُعا قبول ہوئی۔ مسلمانوں کا جذبۂ سرفروشی کام آیا۔ آخر میدانِ جنگ سے کفار اپنے قیدیوں اور لاشوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کفارِ قریش کے متعدد سردار مارے گئے۔ ان میں اسلام کا سب سے بڑا مشہور دشمن ابُوجہل بھی تھا۔ اُس نے مرتے وقت ایڑیاں رگڑتے ہوئے افسوس کے لہجے میں کہا کہ ہائے! میری موت د

بچوں کے ہاتھ سے واقع ہوئی، جن کی عمریں تیرہ چودہ سال سے زائد نہ تھیں۔ قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے اُن میں حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ بھی شامل تھے۔

اِس شکست کی خبر شکست خوردہ فوج کے مکّے پہنچنے سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ مکّے میں ہر طرف ایک کُہرام برپا ہو گیا۔ گھر گھر سوگ اور گلی گلی فریاد و ماتم کی سی کیفیت تھی۔ مکّے کے اکابر اور جہاں دیدہ قُریش نے بتوں کی قسمیں کھا کر اعلان کیا کہ جب تک وہ بدر کی شکست کا بدلہ نہ لے لیں گے، چَین سے نہ بیٹھیں گے۔ مسلمانوں نے کافروں کے جن قیدیوں کو گرفتار کیا تھا، اُن کے ساتھ نہایت ہی فیاضانہ سلوک کیا گیا اور اِس کے باوجود کہ فریقین کے درمیان جنگ کا سلسلہ جاری تھا، قیدیوں سے فدیہ لے کر اُنھیں رہا کر دیا گیا اور جو نادار تھے اور فدیہ دینے کی استطاعت نہ رکھتے تھے، اُن کو فدیے کے بغیر ہی چھوڑ دیا گیا اور جن کو لکھنا پڑھنا آتا تھا، اُن سے اتنا فدیہ ہی کافی سمجھا گیا کہ وہ مدینے میں رہ کر بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں اور جن بچوں کو وہ تعلیم دیں، اُن کے ذِمّے اُن قیدیوں کے خورد و نوش کی کفالت رہے۔ چنانچہ صحابۂ کرامؓ خود تو کھجوروں پر بسر کرتے اور اُن کو عُمدہ غذا کِھلاتے۔ کسی قیدی پر بھی رہائی حاصل کرنے کے لیے مسلمان ہونے کی شرط نہیں لگائی گئی۔

کفارِ مکہ بدر کی شکست کے انتقام کا اعلان تو کر ہی چکے تھے۔ اب اُنھوں نے تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ جنگ کے اخراجات کے لیے مکّے کے تاجروں نے اپنے تجارتی کاروبار کا منافع پیش کیا، دوسرے لوگوں نے بھی دل کھول کر چندے دیے۔ ایک سال تک جنگ کی تیاری ہوتی رہی۔ جب جنگی ضرورت کی ہر چیز خاطر خواہ مہیا ہو گئی تو تین ہزار

کفار کا دوسرا حملہ

کے لشکر نے پنجشنبہ کے دِن ہجرت کے تیسرے سال مدینے کی طرف کوچ کیا۔ لشکریوں کے علاوہ عورتوں کو بھی ساتھ رکھا گیا تاکہ وہ میدانِ جنگ میں اپنے بہادروں اور تیغ زنوں کو غیرت دلائیں اور اُن کی ہمتیں بڑھائیں۔ اِس لشکر نے اُحد کے مقام پر جو مدینے کے شمال کی طرف تین میل پر ایک پہاڑ ہے اُس کے دامن میں ڈیرے ڈال دیے۔ مدینے کی چراگاہوں پر قبضہ کر لیا اور ہرے بھرے کھیتوں کو اجاڑ ڈالا۔ جُمعے کے دِن رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حسبِ معمول صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ فیصلہ یہ ہُوا کہ مدینے سے باہر نکل کر لشکر کا مقابلہ کیا جائے۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اگرچہ اس رائے سے مُتفق نہ تھے، مگر آپ نے صحابہؓ کی رائے قبُول فرمالی۔ یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اِسلام حریتِ فکر کا سب سے بڑا علَم بردار ہے۔

کفّارِ قریش کثیر ساز و سامان کے ساتھ بہت بڑا لشکر لے کر مدینے پر حملہ کرنے کے لیے احد تک پہنچ چکے تھے۔ حملہ آوروں کا دفاع ضرُوری تھا۔ چنانچہ اُن کے مقابلے اور دفاع کے لیے ایک ہزار کی جمعیت مدینے سے روانہ ہُوئی، مگر تھوڑی دور چلنے کے بعد رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ مدینے واپس ہو گیا۔ اب صرف سات سو مسلمان رہ گئے، جن میں سَو زِرہ پوش تھے۔ کتنا نازک موقع تھا۔ دُشمن حملے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ نظر آتا ہے۔ ایسے میں فوج سے تین سو سپاہیوں کا کم ہو جانا کس قدر تشویش کی بات تھی، مگر مسلمانوں کی ہمتوں میں اس واقعے سے ذرا سی بھی کمزوری پیدا نہیں ہُوئی۔ ان کو اپنے اللہ کی نصرت پر بھروسا تھا۔ ایسے مواقع پر ہمیشہ اللہ اور رسُولؐ کی اطاعت اور محبت کے جذبے نے ساز و سامان اور سپاہیوں کی تعداد کی کمی کو پُورا کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفسِ نفیس اسلامی فوج کی صف آرائی کی۔ فوج کی پُشت کی جانب ایک درہ تھا۔ حضورؐ نے پچاس تیراندازوں کو وہاں متعین فرماکر تاکید کی کہ اسلامی فوج کی چاہے جیت ہو یا ہار، اس جگہ کو ہرگز نہ چھوڑیں۔ حضورؐ نے ان جاں نثاروں اور سرفروشوں کے دلوں میں اس حقیقت کو اتار دیا تھا کہ ہمارا مقصد خوں ریزی، غارت گری اور حصولِ مال و دولت نہیں ہے۔ ہمارا جینا اور مرنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے اور جہاد فی سبیل اللہ، اللہ کے کلمے اور توحید کے پرچم کو بلند کرنے کا نام ہے۔

غزوہِ احد میں بھی کفار کی طرف سے حملے کی پہل ہوئی۔ مسلمانوں نے اس کے جواب میں اس قدر جوش و ہمت کے ساتھ دفاعی جنگ لڑی کہ دشمنوں کی صفیں اُلٹ کے رکھ دیں۔ کفارِ قریش بھی آج اپنی جانوں تک کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ خوب جان توڑ کے لڑے مگر اسلامی فوج کے مقابلے میں ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ کفار اسلامی فوج کے حملے کی تاب نہ لاکر میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے اُن کا تعاقب کیا اور مسلمان تیرانداز، جن کو حضورؐ نے تاکید فرمائی تھی کہ کسی حال میں بھی درہ نہ چھوڑیں، وہ بھی تعاقب کرنے والوں کے ساتھ ہو لیے۔ خالد ابنِ ولید نے جو ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے اور کافروں کی طرف سے جنگ کر رہے تھے، اس اہم مقامِ دفاع کو خالی پاکر دو سو آدمیوں کے ساتھ مسلمانوں کے عقب کی سمت سے عین اُس وقت حملہ کیا جب کہ مسلمانوں کی صفوں میں ترتیب باقی نہیں رہی تھی۔ اس طرح مسلمانوں کی فوج دونوں طرف سے گھر گئی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور دُوسری بیبیاں عین حالتِ جنگ میں زخمیوں کو پانی پلا رہی تھیں۔ اتنے میں غُل مچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم شہید ہوگئے۔ اس افواہ سے

مُسلمانوں میں اور سراسیمگی پھیل گئی ۔ ذرا سی دیر میں جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ یا تو مُسلمان شکست خوردہ کافروں کا پیچھا کر رہے تھے اور اُن کو رگیدے چلے جا رہے تھے یا اب لڑائی کا نقشہ کچھ ایسا ہو گیا کہ کافر غالب نظر آ رہے تھے۔ حضورؐ کی شہادت کی خبر نے مُسلمانوں کو اور زیادہ دل شکستہ کر دیا۔ ایک صحابیؓ تلوار لیے ہُوئے سکوت و حیرانی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ اُن کے ساتھی نے پوچھا کہ یہ بیٹھیں کیا ہو گیا ہے؟ بولے "حضورؐ شہید ہو گئے" اُن کے ساتھی نے فوراً جواب دیا "جب حضورؐ ہی دُنیا میں نہ رہے تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے؟"

حالات بہت زیادہ نازک تھے، مگر مُسلمانوں نے اپنے کو بہت جلد سنبھال لیا۔ اُنھوں نے منتشر جاں بازوں کی صفیں مُرتّب کیں اور پھر جو اللہ کا نام لے کر کافروں پر حملہ کیا ہے تو اُن کی ہمتیں پست کر دیں۔ کفارِ مکّہ اسلامی لشکر کے اِس حملے کی تاب نہ لا سکے۔ اُنھوں نے مقاومت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر مایوسی کے عالم میں میدانِ جنگ سے پسپا ہوتے ہُوئے شہیدوں کی لاشوں کا مُثلہ کیا یعنی ناک، کان کاٹ دیے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے چچا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ جن کو اِس جنگ میں وحشی غُلام نے شہید کیا تھا، اُن کا جگر ابُو سفیان کی بیوی ہندہ نے چبا ڈالا۔

مدینے میں جب مسلمانوں کی شکست کی خبر پہنچی تو ایک انصار خاتون کو اس کی اطلاع بھی ملی کہ اُس کا باپ شہید ہو گیا۔ اُس نے یہ سُن کر حضورؐ کی خیریت پُوچھی۔ پھر لوگوں نے کہا "تیرا بھائی بھی مارا گیا"۔ اُس نے پھر حضورؐ کے بارے میں دریافت کیا۔

اس سے پھر کہا گیا "تیرا خاوند بھی کام آگیا"۔ اُس نے اس پر بھی یہی کہا" لوگو! یہ تو بتاؤ، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں ہیں"۔ وہ اُحد کی جانب تیزی کے ساتھ روانہ ہوئی اور حضورؐ کے چہرۂ مُبارک کو دیکھ کر بولی "اگر آپ زندہ ہیں تو ساری مُصیبتیں ہیچ ہیں"۔

کفار کا لشکر بڑی ہی سراسیمگی کی حالت میں پسپا ہُوا۔ راستے میں خیال آیا کہ مکّے پہنچ کر ہم لوگوں کو اپنی فتح مندی کا یقین کس طرح دلائیں گے۔ جب کہ مُسلمانوں کا ایک قیدی بھی ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ یہ سوچ کر وہ پھر پلٹنا چاہتے تھے مگر ہمت نہ پڑی۔ کُچھ دور چل کر رُک گئے۔ حضورؐ کو جب اس کی خبر ہُوئی تو اِسلامی فوج کے دستے کافروں کے تعاقب میں روانہ فرمائے۔ مگر کفار کے لشکر کا سپہ سالار ابُوسفیان اپنی فوج کو بھگا لے گیا۔

اِس جنگ کا یہ نتیجہ نکلا کہ قبائلِ عرب میں اسلام کے خلاف شورشیں بڑھ گئیں اور اُنھیں اِس کی توقع ہوگئی کہ اب قریشِ مکّہ مُسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کر کے دم لیں گے۔ اُحد مسلمانوں کی شکست کا پیش خیمہ ہے۔ اس سے اِرد گرد کے چھوٹے چھوٹے قبائل کے بھی حوصلے بڑھ گئے اور انھوں نے اپنی اپنی جگہ مسلمانوں پر چڑھائی کی تیاریاں شرُوع کر دیں۔ مدینے کے یہُودی بھی کسی ایسے ہی موقع کے مُنتظر تھے، بلکہ امید لگائے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے مُسلمانوں سے جو معاہدے کیے تھے، ان کی متعدد بار خلاف ورزی کی اور دُشمنوں سے ساز باز کیا۔ اِس طرح مُسلمانوں کے لیے نہ مدینے کے اندر امن رہا اور نہ باہر! مدینے سے باہر کفارِ قریش کا خطرہ۔ مدینے کے اندر منافقوں اور یہُودیوں کی سازشوں کا اندیشہ صحابۂ کرامؓ ان خطروں کی وجہ سے دن رات ہتھیار باندھے رہتے۔ بالآخر اُنھوں نے

حضورؐ سے عرض کیا۔ آپؐ نے تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا "امن کا زمانہ دُور نہیں ہے"۔

غزوۂ اُحد کے بعد ہی مکّے اور اُس کے اطراف میں قحط پڑا۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو جب اُن لوگوں کے مصائب کی اطلاع ملی تو آپؐ نے مہاجرین و انصار سے چندے کی اپیل کی اور خاصی رقم جمع ہو گئی تو مکّے والوں کے پاس بھجوا دی۔ یہ تھا حضورؐ کا حُسنِ سلوک اپنے دشمنوں کے ساتھ۔ مگر اُن سنگ دِلوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور نہ اُن کی دشمنی کی آگ ہی ٹھنڈی ہوئی۔

ہجرت کے چوتھے سال بنی عامر کا سردار حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے قبیلے میں دینی مسائل سکھانے کے لیے معلّم بھیجنے کی درخواست کی۔ آپؐ نے ستّر معلّمین اور قاری اس کے ساتھ کر دیے، جن کو دھوکا دے کر راستے ہی میں شہید کر دیا گیا صرف ایک قاری کسی طرح جان بچا کر مدینے پہنچا اور سارا ماجرا حضورؐ کو سنایا۔ حضورؐ کو بہت صدمہ ہوا۔ اس کے بعد دو اور قبیلوں نے بھی حضورؐ کے بھیجے ہوئے معلّمینِ دین و قرآن کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ ان میں سے آٹھ کو شہید کر دیا گیا اور دو کو قیدی بنا کر کفّارِ مکّہ کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اُن میں سے ایک کا نام خبیبؓ اور دوسرے کا نام زیدؓ تھا۔ حضرت خبیبؓ نے قتل ہونے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کی اور اپنے قاتلوں سے کہا آج دیر تک نماز پڑھنے کو جی چاہتا تھا مگر اس خیال سے نماز مختصر کر دی کہ کہیں تم لوگ یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی عمر کے لمحے بڑھانے اور زندہ رہنے کے لیے نماز کو طُول دے رہا ہوں۔ زیدؓ کو قتل کرنے سے پہلے ابُوسفیان نے کہا "کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تمھاری جان بچ جائے اور تمھارے بجائے تمھارے نبی قتل کر دیے جائیں"۔ اس پر اس عاشقِ رسُولؐ نے جواب دیا "میں

تو اپنی جان کو اتنی وقعت بھی نہیں دیتا کہ میں بچ جاؤں اور حضورؐ کے ایک کانٹا ہی چبھ جائے۔"

ہجرت کا پانچواں سال تھا۔ یہودیوں، منافقوں اور مشرک قبائل کی شکل میں چاروں طرف دشمنانِ اسلام پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے حملے اور اوچھے وار کرتے رہتے مگران کو ہر بار ناکامی ہوتی۔ یہودی جو اپنی سازشوں اور مخالفانہ روشوں کے سبب مدینے سے نکال دیے گئے تھے وہ خیبر میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ انھوں نے قریشِ مکّہ سے مل کر اسلام پر آخری اور کاری بلکہ فیصلہ کُن ضرب لگانے کی ٹھانی اور غزوۂ اُحد کے دو سال بعد ایک لشکرِ جرّار لے کر مدینے کی طرف کوچ کیا۔

اس لشکر کی تعداد دس ہزار سے چوبیس ہزار تک بیان کی جاتی ہے۔ عرب کی تاریخ میں شاید ہی اس سے بڑی فوج کبھی جمع ہوئی ہو۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس کی خبر ملی تو صحابہؓ کرام کو صلاح و مشورہ کی غرض سے طلب فرمایا اور حضرت سلمان پارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے کے مطابق مدینے کے اِردگرد خندق کھودی گئی۔ جب خندق کھودی جا رہی تھی تو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی صحابہؓ کے ساتھ مزدوروں کی طرح خندق کھودتے برابر دیکھے جاتے رہے۔ محنت مشقت دوسروں کے لیے عار ہو تو ہو، مسلمانوں کا تو یہ فخر ہے۔

اس عظیم فوج اور کثیر تعداد لشکر نے اس شدت کے ساتھ حملہ کیا کہ مدینے کی سرزمین کانپ اٹھی۔ مسلمانوں نے احتیاط و نزاکتِ حال کے پیشِ نظر عورتوں کو محفوظ مقامات پر پہنچا دیا۔ یہ محاصرہ ایک مہینے تک جاری رہا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم

اور صحابہؓ نے فاقوں کی تکلیفیں برداشت کیں۔ جب کئی کئی دن کھانے کو کچھ نہ ملتا تو اپنے پیٹوں پر پتھر باندھ لیتے تاکہ بھوک کی شدت عزم و استقلال کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے پائے اور عزیمت کی بلندی میں کسی قسم کی پستی اور ضعف پیدا نہ ہو۔ اکا دُکا مقابلے دونوں فوجوں میں ہُوئے۔ عرب کا مشہور پہلوان عبدِ ود جو ایک ہزار شہ زوروں کے برابر سمجھا جاتا تھا، بڑے فخر و غرور سے میدان میں آیا، مگر ذُوالفقارِ علی کرم اللہ وجہہ کے ایک ہی وار میں وہ خاک و خُون میں تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ کافروں نے بڑے زور شور سے حملہ کیا، لیکن خندق حائل ہونے کے سبب زیادہ تعداد میں پیش قدمی نہ کر سکے۔ اِس عرصے میں کفّار کی فوج میں رسد نہ پہنچنے کی وجہ سے کچھ بے اطمینانی اور کچھ انتشار پھیلنا شروع ہو گیا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ ایک رات زبردست آندھی آئی، جس نے کافروں کے لشکر کے خیموں کی طنابیں اکھیڑ دیں۔ خیمے زمین پر گرے تو اس کی وجہ سے خورونوش کا سامان مٹی میں مِل گیا۔ سردی کی سیاہ اور مہیب رات، طوفانی آندھی، خیموں کا ایک ایک کر کے گرنا۔ فوج میں ابتری اور سراسیمگی پھیل گئی اور یہ لوگ گھبرا کر رات کی تاریکی میں محاذِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ صبح ہُوئی تو میدان صاف تھا اور محاصرہ ختم ہو چکا تھا۔ اِس طرح اللہ تعالیٰ نے مُسلمانوں کو بیرُونی دشمنوں کے جرّار لشکر اور اندرونی سازشوں سے محفُوظ رکھا۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسا ہو اور بھروسا کرنے والوں میں دین کی سربلندی کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دینے کا عملی جذبہ بھی ہو تو مصیبت کے وقت غیب سے بھی تائید و نصرت کے سامان ہو جاتے ہیں۔ اِس ناکامی کے بعد قریش مکّہ اور دوسرے قبائل کو پھر کبھی مدینے پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

مدینے کے یہودی خاصے طاقت ور اور بااثر تھے۔ علم و دولت میں یہ لوگ انصار پر فوقیت رکھتے تھے۔ سود خواری، تجارت پیشہ ہونے کے سبب دولت مند بھی تھے۔ اس لیے انصار ان کے مقروض رہتے تھے۔ یہودیوں کو اپنے مال و دولت کا بہت غرّہ تھا اور مدینے کی سوسائٹی میں وہ اپنی برتری کا احساس رکھتے تھے۔ اسلام جس قدر ترقی کرتا گیا، یہودیوں کا دلی بغض و حسد بھی اُتنا ہی بڑھتا گیا اور پھر وہ ذلیل ترین حرکتوں پر اُتر آئے۔ مسلمان عورتوں کے خلاف شعر پڑھتے، انھیں بازاروں میں چھیڑتے اور دِق کرتے۔ یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخیاں کرنے سے بھی باز نہ آتے۔ اُن کے اور مسلمانوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، اسے تو وہ توڑ ہی چکے تھے۔ اب ان کی یہ بری خصلتیں اس حد تک پہنچ چکی تھیں کہ انھوں نے خود رسالت مآبؐ کو دھوکے سے قتل کرنے کی کوشش کی اور اس میں ناکام رہے۔ یہودیوں کے دو قبیلوں نے مسلمانوں سے لڑائی کی ٹھان لی اور قلعہ بند ہو بیٹھے۔ جن کا مسلمانوں کو محاصرہ کرنا پڑا اور بالآخر یہی تصفیہ ہوا کہ یہ لوگ مدینہ چھوڑ کر چلے جائیں۔ کوئی حکومت اور کوئی سوسائٹی بھی ایسے سازشیوں، مفسدوں اور عہد شکنوں کو گوارا نہیں کر سکتی۔ ان میں سے کچھ لوگ شام چلے گئے اور کچھ خیبر کے علاقوں میں جاکر آباد ہو گئے۔ یہ لوگ مدینے سے جاتے ہوئے جس قدر مال و اسباب ساتھ لے جا سکتے تھے، لے گئے۔ یہ تھا اسلامی ریاست کے صدر کا سلوک اُس قوم کے ساتھ جو وعدہ خلافی کے علاوہ ہمیشہ اسلام کی بیخ کنی اور مسلمانوں کی تباہی کے درپے رہی۔

ایک طرف مٹھی بھر مسلمان، دوسری طرف پورے ملک کی مخالف قوتیں، تلواریں

چمکیں، کمانوں سے تیر برسائے گئے۔ نیزے حرکت میں آئے۔ مدینے میں مسلمانوں پر مسلسل پانچ سال تک حملے ہوتے رہے، مگر ان تمام خطروں، پریشانیوں، مصیبتوں اور سخت آزمائشوں کے باوجود اہلِ ایمان کے پائے استقامت کو جنبش تک نہ ہُوئی۔ دین تلوار کے مقابلے میں پھلتا پھُولتا رہا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا؟ اس لیے کہ اوّل تو اپنے مقصد کی صداقت پر انھیں پورا یقین تھا کہ جو مقصد ہمارے پیشِ نظر ہے اُس سے انسانیت کی بھلائی وابستہ ہے، دوسرے انھیں اپنے مقصد سے جو لگن تھی، اُس میں اخلاق ہی اخلاق کارفرما تھا، جو ہوائے نفس کی ہر ملاوٹ سے پاک تھا۔

ہجرت کے چھٹے سال جب حج کا زمانہ آیا تو رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم چودہ سَو صحابہؓ کے ہمراہ حج کے ارادے سے عازمِ مکّہ ہُوئے۔ اس خیال سے کہ کفّار جنگ کے لیے مشتعل نہ ہو جائیں، اس قافلے نے اپنے ساتھ ہتھیار بھی نہیں لیے۔ قربانی کے جانور البتہ اُن کے ہمراہ تھے اور شمعِ حق کے یہ پروانے احرام باندھے ہُوئے تھے۔ مکّے کے قریب یہ قافلہ پہنچا تو معلوم ہُوا کہ کفّارِ مکّہ جنگ پر آمادہ ہیں اور مسلمانوں نے اگر مکّے کی حدُود میں قدم رکھا تو وہ ضرور مزاحمت کریں گے۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حدیبیہ کے مقام پر، جہاں ایک کنُواں بھی ہے، قیام کیا اور وہیں اس قافلے نے پڑاؤ ڈال دیا۔ حضورؐ نے کفّار کے پاس اپنا ایک قاصد بھیجا کہ "ہم تو صرف حج کی نیت اور ارادے سے آئے ہیں، جنگ کرنے کے لیے نہیں آئے۔ بہتر ہے کہ قریش ایک مدت کے لیے ہم سے صُلح کر لیں"! اُدھر قریش نے اپنا جاسوس مسلمانوں کے حالات معلوم کرنے کی غرض سے بھیجا۔ اس نے مکّے واپس جا کر کہا "میں نے قیصر و کسریٰ کے دربار

دیکھے ہیں، مگر جیسے جاں نثار محمدؐ ابن عبداللہ کو ملے ہیں، اُن کی کوئی مثال نہیں۔ اُن کے نبیؐ جب وضُو کرتے ہیں تو یہ لوگ وضُو کا پانی زمین پر نہیں گرنے دیتے۔"

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا بھیجا ہُوا پہلا قاصد جب کوئی جواب نہ لایا تو حضورؐ نے دوسرا قاصد روانہ کیا، جس کی سواری کے اُونٹ کو کفار نے ہلاک کر دیا۔ قریش کا ایک مسلح دستہ بھی مسلمانوں پر حملہ کرنے کی غرض سے نکلا مگر اسے مسلمانوں نے گرفتار کر لیا۔ چونکہ حضورؐ جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے، اس لیے ان لوگوں کو چھوڑ دیا۔ بالآخر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر بھیجا۔ قریش نے انھیں روک لیا اور اُن کا قتل کیا جانا مشہور کر دیا۔ اس خبر کی شہرت نے کفار کے ارادے بے نقاب کر دیے کہ وہ لڑائی کے لیے تلے ہُوے ہیں۔ اس عالم میں رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صحابہ کرامؓ سے جاں فروشی اور سرفروشی کی بیعت لی۔ یہ اسلامی تاریخ کا نہایت ہی اہم واقعہ ہے، جو "بیعتِ رضوان" کے نام سے مشہور ہے، جس میں صحابہؓ نے پُورے شرحِ صدر اور رضامندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانیں دے دینے کا عہد کیا۔ مسلمان مدینے سے جنگ کرنے کی نیت سے نہیں، حج کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ اس لیے اُن کے پاس جنگی ساز و سامان اور اسلحہ نہیں تھا، لیکن وُہ ایمان کی قوت اور شوقِ شہادت سے آراستہ و پیراستہ تھے۔

جب کفار کو اس کا علم ہُوا کہ مسلمان جان کی بازی لگا دینے کا عہد کر چکے ہیں، جس کا انھیں پچھلے معرکوں میں بھی اچھی طرح تجربہ ہو چکا تھا تو ناچار اُنھوں نے سُہیل کو اپنا سفیر بنا کے صُلح کی شرائط طے کرنے کے لیے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں

بھیجا۔ کفار کی پہلی شرط یہ تھی کہ مسلمان بغیر حج کیے واپس چلے جائیں۔ اس معاہدے میں بظاہر مسلمانوں کو ایک مغلوب فریق کی حیثیت دی گئی تھی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امن و صلح کے خواہاں تھے۔ آپ نے اس شرط کو منظور فرمالیا۔ معاہدے کی خاص شرائط یہ تھیں:۔

۱۔ مسلمان اس سال بغیر حج کیے واپس چلے جائیں۔

۲۔ اگلے سال آئیں، مگر تین دن سے زیادہ قیام نہ کریں۔

۳۔ مکے میں جو مسلمان ہیں، ان کو ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے اگر کوئی مکے میں رہنا چاہے تو اسے نہ روکیں۔

۴۔ مکے والوں میں سے کوئی مدینے چلا جائے، تو مسلمان اُسے واپس کر دیں لیکن اگر کوئی مسلمان مکے میں چلا آئے تو کفار اُسے واپس نہیں کریں گے۔

جب معاہدہ لکھا جا رہا تھا تو "محمدؐ رسول اللہ" لکھے جانے پر سفیرِ قریش نے اعتراض کیا کہ اگر ہم محمدؐ کو اللہ کا رسول مان لیتے تو یہ لڑائیاں کیوں ہوتیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس صلح نامے کے کاتب تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ "میں اپنے ہاتھ سے لفظ رسول اللہ' نہیں مٹا سکتا۔" رسول اللہ' کس مقام پر لکھا ہوا تھا' یہ بتانے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ سے اس مقام پر قلم پھیر دیا اور اب عبارت کی اصل صورت یہ ہوگئی کہ "محمدؐ رسول اللہ' کے بجائے محمدؐ ابن عبداللہ" تحریر کیا گیا۔ یہ بھی ایک اور سچائی کی دلیل۔ آپؐ اللہ کے رسول تو تھے ہی۔ کفار نے جو معاہدے میں آپؐ کے رسول ہونے میں انکار کر دیا' اس سے آپؐ کے منصبِ رسالت میں ذرہ برابر کمی نہیں آئی۔ سورج

خود اپنی روشنی کی دلیل ہے۔

یہ معاہدہ ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ اتنے میں سُہیل سفیرِ قریش کا بیٹا جو مکے میں مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا، وہاں آپہنچا۔ اس نوجوان کو کفارِ قریش نے مکے میں قید کر رکھا تھا اور اسے بڑی اذیتیں پہنچائی تھیں، جن کی گواہی اس کے جسم کے نشانات دے رہے تھے۔ سُہیل کے اصرار پر ابُو جندلؓ کو مکے واپس کیا گیا اور اس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سفارتی آداب و پابندیِ عہد کی روشن مثال قائم فرما دی۔ ایک تو صلح کی شرائط جو بہ ظاہر مسلمانوں کے مغلوب ہونے کا اعلان تھیں، دوسرے حضرت ابو جندلؓ کا مکے کو واپس کیا جانا۔ اس نے بعض صحابہؓ کو بے تاب کر دیا اور انھوں نے اپنی اس بے تابی کو چھپایا نہیں۔ حضورؐ کے روبرو آزادی کے ساتھ اپنے ان بے تابانہ جذبات کا اظہار بھی کر دیا۔ ان صحابہؓ کی یہ بے تابی اپنی ذات کے لیے نہیں، اسلام ہی کی خیر خواہی کی خاطر تھی۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اس معاہدے اور صلح میں خیر کا جو پہلو دیکھ رہے تھے، ان ناقدین کو نظر نہ آتا تھا۔ حضرت ابُو جندلؓ کو مکے واپس بھیجتے ہُوئے حضورؐ نے فرمایا "عہد کی پابندی ضروری ہے۔ چاہے وہ کافروں ہی سے کیوں نہ ہو۔"

یہ صلح جو دیکھنے میں مسلمانوں کی شکست نظر آتی تھی۔ اسلام کی فتحِ مُبین ثابت ہُوئی۔ اس صُلح نے اسلام کی ترقی کی بہت سی راہیں کھول دیں اور امن و صُلح کی فضا میں اسلام کی اشاعت و ترقی کے مواقع میسر آئے۔

مکے میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اسلام کی طرف مائل تھے بلکہ اسلام قبول کرنا چاہتے تھے، مگر صلحِ حدیبیہ کی شرائط کی موجودگی میں ان کے لیے اسلام کا کھل کر اعلان کرنا

ممکن نہ تھا۔ اُنھیں میں سے ایک نومسلم، عتبہؓ کفار کے مظالم سے تنگ آکر مکّے سے بھاگ کر مدینے پہنچے اور اُن کے پیچھے پیچھے کفارِ مکّہ کے دو قاصد بھی مدینے میں آدھمکے اور صُلح نامے کی رُو سے عُتبہؓ کی واپسی کا مُطالبہ کیا۔ حضورؐ نے عتبہؓ سے مکّے واپس جانے کے لیے کہا۔ حضرت عتبہؓ نے بہت مُلول اور دِل گرفتہ ہو کر عرض کیا "آپ مجھے کفر پر مجبور کرتے ہیں"۔ حضورؐ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا "میں تمھیں واپس کرنے پر مجبور ہُوں۔ ہاں، اللہ کوئی راہ نکالے گا"۔ یہ تھا پابندیِ عہد کا وُہ بے مثال عملی سبق جو رہتی دُنیا تک انسانیت کے لیے مشعلِ راہ رہے گا۔ دوسری طرف حضرت عتبہؓ ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حُکم کی اطاعت میں اپنی جان خطرے میں ڈال دیتے ہیں اور مکّے کو واپس چلے جاتے ہیں۔ اسلام نے صحابہؓ میں آزمائش و امتحان کی سختیوں سے دوچار ہونے کا کس قدر حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ جو مسلمان مکّے میں تھے، اُن کے کسی قول و فعل کے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قطعاً ذمے دار نہ تھے۔ حضورؐ نے معاہدے کی اس شرط کی پابندی فرمائی کہ جو مسلمان مکّے سے مدینے چلا آئے اُسے واپس فرما دیں۔ حضرت عتبہؓ مدینے سے مکّے کو واپس جا رہے تھے۔ دو کافر اُن کو حراست میں لیے ہُوئے تھے، موقع پا کر عُتبہؓ نے ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا شخص بھاگ گیا۔ حضرت عُتبہؓ نے مکّے کے بجائے سمندر کے ساحلی علاقے میں سکُونت اختیار کی۔ یہ علاقہ نہ تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تسلط تھا اور نہ کفارِ قریش کا اس سے کوئی واسطہ اور تعلق تھا۔ اس کی حیثیت سیاست کی اصلاح جدید میں (NO MAN'S LAND) کی تھی۔ عُتبہؓ نے اِس طرح مکّے کے ستم رسیدہ مسلمانوں کے لیے مصائب سے چھٹکارا پانے کا راستہ کھول دیا۔ مکّے میں کافروں کے ظلم و ستم سے

تنگ آکر مسلمان وہاں سے بھاگ کر کسی طرح اس علاقے میں آکر آباد ہو جاتے۔ اس طرح سمندر کے ساحلی علاقے میں مسلمانوں کی چھوٹی سی نوآبادی قائم ہو گئی۔ یہ علاقہ صلحِ حدیبیہ کی شرائط کے نفاذِ عمل سے آزاد تھا۔ مکّے سے جو تجارتی قافلے شام کو جاتے تھے وہ اسی ساحلی علاقے سے گزرتے تھے۔ قریشِ مکّہ کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اس نوآبادی کے باشندے اُن کی تجارت کی راہ میں رُکاوٹ بنیں گے۔ اس اندیشے کے سبب قریش نے خود حضورؐ سے درخواست کی کہ صلحِ حدیبیہ کی یہ شرط کہ مکّے سے بھاگے ہُوئے مسلمان کو پھر مکّے واپس کیا جائے، منسوخ اور کالعدم قرار دی جائے۔

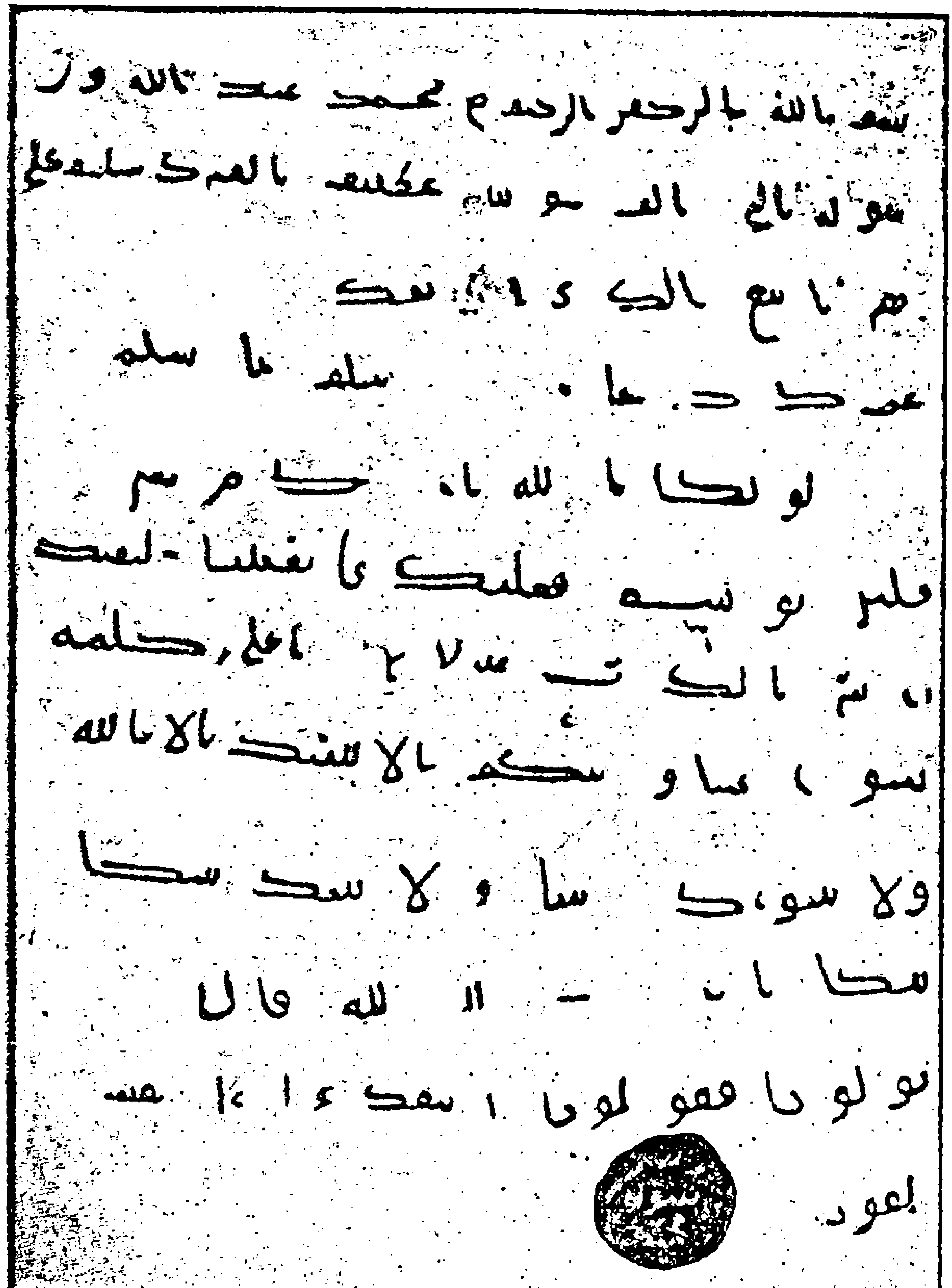
حدیبیہ سے واپسی پر جب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم مدینے پہنچے تو معلوم ہوا کہ خیبر کے یہودیوں نے مدینے پر چڑھائی کرنے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں اور اُن کے خطیب قبائل کو بھی مسلمانوں کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ خیبر یہودیوں کی آماجگاہ تھا۔ مدینے سے جلاوطن ہو کر یہودیوں کی زیادہ تر تعداد یہیں آباد ہو گئی تھی خیبر میں مضبوط قلعے تھے، جن میں سے ایک دو قلعے تو اُس زمانے کے حالات کے اعتبار سے ناقابلِ تسخیر سمجھے جاتے تھے۔ یہ ہجرتِ نبوی کا ساتواں سال تھا۔۔۔۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تقریباً سولہ سَو صحابہؓ کے ساتھ خیبر کی طرف بڑھے اور وہاں پہنچ کر بیس دن تک محاصرہ جاری رکھا۔ بالآخر حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کے ہاتھوں یہ قلعہ فتح ہوا۔

خیبر کے ایک یہودی رئیس کی بیوی نے جس کا شوہر اس جنگ میں کام آچکا تھا۔ حضورؐ کو کھانے کی دعوت دی اور کھانے میں زہر ملا دیا۔ حضورؐ نے روٹی کا

ایک لقمہ اُٹھاکر ہاتھ روک لیا، مگر ایک صحابی بشیرؓ بن براء جو کئی لقمے کھا چکے تھے، زہر کے اثر سے فوت ہو گئے۔ یہودیوں نے مغلوب ہونے اور ہار ماننے کے بعد حضورؐ سے درخواست کی کہ ہماری زمینیں بدستور ہمارے قبضہ و تصرف میں رہنے دی جائیں، اُن کی بٹائی یعنی نصف پیداوار ہم اسلامی حکومت کو دیتے رہیں گے۔ حضورؐ نے ایک اُس شکست خوردہ قوم کی جس پر آپؐ کو پورا قبضہ اور اختیار حاصل تھا۔ درخواست اور پیش کی ہوئی شرط منظور کر لی۔ مگر اس عہد شکن اور احسان فراموش قوم کا یہ کردار تھا کہ حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ اور سلطان و فرماں روا کو ہلاک کرنے کی سازش کی۔ اِس جرم کی پاداش میں قوم کی قوم کو سزا دی جا سکتی تھی، لیکن حضورؐ نے صرف اُس عورت کو قصاص میں قتل کرنے کا حکم دیا، جس کے زہر دینے سے صحابیؓ کی موت واقع ہوئی تھی۔

اِسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہزار رفیقوں اور جاں نثاروں کے ساتھ عمرہ ادا کیا اور حدیبیہ کے معاہدے کی پوری پوری پابندی کی۔ کفارِ قریش کو مسلمانوں کی جانب سے ذرہ برابر کسی بے عنوانی کی شکایت نہ ہوئی۔ حالانکہ اب مسلمان پہلے کی طرح مظلوم نہیں رہے تھے۔ ان میں اتنی طاقت تھی کہ کفارِ قریش سے برابر کی ٹکر لے سکتے تھے۔

اِسلام صرف عربوں کی اِصلاح کے لیے نہیں آیا تھا۔ یہ تو عالم گیر دین اور اللہ تعالیٰ کا آخری اور مکمل دین ہے۔ ساری انسانیت کی فلاح و نجات اِسی دینِ حق سے وابستہ ہے۔ چنانچہ اب وقت آگیا تھا کہ ساری دُنیا میں اس پیغام کو پہنچایا



عکس ـــــــ فرمانِ نبویؐ

جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصرِ روم، کسرائے ایران، عزیزِ مصر، نجاشی شاہ حبش اور غسان و یمامہ کے رئیسوں کو خطوط کے ذریعے اسلام کی دعوت دی۔ بلا کسی حکمتِ عملی اور سیاسی مصلحت کے سب کو یکساں اور ایک ساتھ خطوط روانہ فرمائے اور کمزور و طاقت ور سلطنتوں میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا۔ صحابہؓ کے مشورے سے ان خطوط کے لیے مُہر بنوائی جو ان فرامین پر ثبت کی گئی۔ اس مُہر کا نقش اس طرح تھا:

اللہ
رسول
محمد

اپنے نام کو حضورؐ نے خصوصیت سے نیچے رکھا کہ عبد اور معبود کا فرق ہر حال میں باقی رہے۔ شاہِ مصر نے اس خط کو محفوظ کر لیا جو اب تک بعینہٖ موجود اور محفوظ ہے۔ جس وقت قیصرِ روم کے پاس حضورؐ کا خط پہنچا تو اتفاقاً ابوسفیان دربار میں حاضر تھا۔ ابوسفیان ابھی تک اسلام نہیں لایا تھا اور تجارتی قافلے کے ساتھ اس مُلک میں گیا ہُوا تھا۔ قیصر نے ابوسفیان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چند سوالات کیے۔ ابوسفیان نے جواب میں کہا:

> "محمدؐ ابن عبداللہ ایک شریف خاندان سے ہے۔ اس کے پیرو روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کبھی عہد کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ رشتے داروں اور دوسرے لوگوں سے اچھا سلوک کرو۔"

قیصر حضورؐ کے نامۂ مبارک اور ابوسفیان کی گفتگو سے متاثر ہو چکا تھا اُس کا دل اندر ہی اندر کہہ رہا تھا کہ یہی وُہ آخری نبیؐ معلوم ہوتے ہیں جن کے آنے کی بشارت عیسٰی مسیح علیہ السلام نے دی ہے۔ اُس نے بڑے بڑے پادریوں کو بُلایا اور اُن سے اسلام کے بارے میں ہمدردانہ گفتگو کی۔ بادشاہ کی طبیعت کا یہ نیا رنگ دیکھ کر وُہ لوگ سخت برہم ہُوئے۔ اُن کی برہمی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وُہ تاج و تخت کو خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ اُس سے ڈر کر قیصر کے دِل میں اسلام کے لیے جو گنجائش پیدا ہُوئی تھی' اُس نے دِل ہی میں دم توڑ دیا۔

ایران کا شاہنشاہ خُسرو پرویز خط کو پڑھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ نامۂ مبارک کو پُرزے پُرزے کر دیا اور طیش میں آکر یمن کے گورنر کو حُکم بھیجا کہ عرب میں جس شخص نے نبوّت کا دعوٰی کیا ہے' اُسے گرفتار کر کے ہمارے دربار میں بھیج دو۔ چنانچہ گورنرِ یمن کے دو آدمی حضورؐ کی خدمت میں پُہنچے اور کسرٰی کا پیغام سُنایا۔ حضورؐ نے فرمایا "جو تمہارا خُداوند بنا پھرتا تھا وُہ مارا جا چکا ہے"۔ اِس خبر کو سُن کر قاصد اُلٹے پاؤں یمن کو واپس ہُوئے اور وہاں پُہنچ کر رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کی تصدیق ہُوئی کہ واقعی اُسی رات خُسرو پرویز کو اُس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر ڈالا۔ اپنی اپنی قسمت اور اپنی اپنی یافت ہے۔ کسرٰی تو جیسا تھا ویسا ہی رہا اور اسی حالت میں مارا گیا، مگر یمن کے گورنر کو ایمان لانے کی سعادت نصیب ہُوئی۔ اِس کے چند سال بعد نامۂ رسُولؐ کے چاک کرنے والے کسرٰی کی خاندانی بادشاہت کے سچ مُچ ٹُکڑے اُڑ گئے۔

نجاشی شاہِ حبش کی طبیعت حق پسند تھی۔ اُس نے نامۂ مبارک پڑھتے ہی اسلام قبول کر لیا۔ رؤسائے عرب میں شرجیل اس قدر ظالم اور حق ناشناس تھا کہ اُس نے اسلامی حکومت کے قاصد کو قتل کر دیا۔ اس کا کھلا ہوا مطلب اعلانِ جنگ تھا، اس سے قبل کہ وہ کوئی قدم اُٹھائے، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیرِ کمان تین ہزار کا لشکر اس کی طرف روانہ کر دیا۔ اِس لشکر میں صحابہؓ اور قریش و انصار کے معززین شامل تھے۔ یہ تھا وہ مساوات کا عملی نمُونہ، جس نے محمُود و ایاز کو ایک صف میں لا کھڑا کیا اور غلام و آقا کی تمیز مٹا دی۔ نسل و رنگ اور امیری و غریبی کے امتیاز مٹانے والے پر ہم صلٰوۃ و سلام بھیجتے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ ساری کائنات ہماری ہم زبان ہے۔

شرجیل نے مُقابلے کے لیے ایک لاکھ کا جرّار لشکر تیار کیا تھا۔ موتہ کے مقام پر جنگ ہُوئی۔ طرفین کے تیغ زنوں اور شہسواروں نے اپنی بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ حضرت زیدؓ اور حضرت جعفر طیّارؓ بڑی دلیری اور شجاعت کے ساتھ لڑتے ہُوئے شہید ہُوئے۔ مشہُور صحابیؓ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بھی میدانِ جنگ میں شہادت نصیب ہوئی۔ اسلامی فوج کے پے درپے تین سردار شہید ہو چکے تھے۔ اس عالم میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جو اب مسلمان ہو چکے تھے، فوج کی کمان سنبھالی اور نہایت ہی فراست، دلیری اور عاقلانہ تدبیر سے اپنی گھری ہوئی فوج کو دُشمن کی گرفت سے بچا کر شرجیل کو شکست دی۔

صُلح حدیبیہ کو منعقد ہُوئے پونے دو سال گزر چکے تھے اور ہجرت کا آٹھواں

سال ختم ہونے کو تھا کہ کفّارِ مکّہ نے عہد شکنی کی۔ ہُوا یہ کہ ایک قبیلہ جو کفارِ مکہ کا معاون اور حلیف تھا۔ اس نے ایک دُوسرے قبیلے پر، جو مسلمانوں کا معاون اور حلیف تھا، حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں اس قبیلے والوں کو شدید جانی و مالی نقصانات اُٹھانا پڑے۔ اس قبیلے کا ایک وفد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہُوا اور سارا ماجرا سُنایا۔ اِس پر حضورؐ نے اپنا قاصد کفّارِ مکّہ کے پاس بھیجا کہ "یا تو ہمارے معاون و حلیف قبیلے کا خون بہا ادا کیا جائے یا تم اپنے مددگار قبیلے کی حمایت سے علیٰحدہ ہو جاؤ یا پھر حدیبیہ کے معاہدے کے ٹوٹ جانے کا اعلان کرو"۔ کفارِ مکہ نے جواب دیا کہ "ہمیں تیسری شرط منظور ہے"۔ اِس طرح اُنھوں نے صُلحِ حدیبیہ کو توڑ دیا، مگر بعد میں جب اُنھیں اِس عجلت اور عاقبت نا اندیشی کا خیال آیا تو رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں ابُوسفیان کو معاہدے کی تجدید کے لیے بھیجا، لیکن یہ ایک سیاسی چال تھی۔

سارے عرب میں مکہ وُہ مقام تھا جو کفار کی سازشوں کا مرکز تھا۔ اِسلام کے خلاف جو فتنہ بھی اُٹھتا تھا اہلِ مکہ کے اِشارے سے اُٹھتا تھا۔ اِن حالات میں اِس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ رہا تھا کہ اِس مرکز کو بے اثر بنا دیا جائے تاکہ کفار کو مُسلمانوں کی طاقت و جمعیت کا صحیح اندازہ ہو جائے اور وہ سازش و فساد اور نزاع و تصادم کی جرأت نہ کر سکیں۔ چنانچہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم صحابہؓ کی ایک بھاری جمعیت لے کر ہجرت کے آٹھویں سال ماہ رمضان المبارک کو مکّے روانہ ہوئے۔ چند سال پہلے مسلمانوں کے لیے عرب میں ہر طرف خطرے ہی خطرے تھے مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے

فتحِ مکّہ

اب ان میں اتنی طاقت پیدا ہوگئی تھی کہ مدینے سے لے کر مکّے تک کوئی قبیلہ بھی اُن کا مزاحم نہ ہوا۔ جب مکّہ ایک منزل کی مسافت یعنی چند میل کے فاصلے پر رہ گیا تو حضورؐ نے صحابہؓ کے ساتھ یہاں پڑاؤ کیا اور حکم دیا کہ سب لوگ الگ الگ آگ روشن کریں تاکہ کفارِ مکّہ کو مسلمانوں کی کثرت تعداد کا اندازہ ہوسکے۔ اور ناحق خُوں ریزی نہ ہو۔ یہ نہایت ہی مناسب اور کارگر تدبیر تھی، جو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو سجھائی تھی۔ اس منظر کا مکّے کے کافروں کے دلوں پر یہ اثر ہوا اور اس قدر رُعب بیٹھا کہ جنگ کے بارے میں انھوں نے اس موقع پر سوچنا ہی چھوڑ دیا اور سب سے پہلے اسلام کا سب سے بڑا دشمن ابوسفیان حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوا اور حضورؐ کے ارشاد کے مطابق مکّے پہنچ کر حضورؐ کا یہ اعلان مشتہر کیا " کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا اُسے امن دیا جائیگا۔ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر رکھے گا' اُس کے لیے امن ہے۔ جو خانۂ کعبہ میں داخل ہوجائے گا، وہ امن میں ہوگا اور جو شخص بغیر ہتھیار کے ملے گا' اس کے لیے بھی امن ہے۔"

اس اعلان میں اس کی شرط نہ تھی کہ جو مسلمان ہوجائے گا' بس اُس کو امن دیا جائے گا بلکہ کافروں کو بحالتِ کفر بھی امن دینے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ یہ تھیں عطرِ محبت کی وہ شمیم انگیزیاں جن سے عرب کی فضا معطّر ہوئی۔

مسلمانوں کی یہ جمعیت مختلف ٹکڑوں کی صورت میں مختلف اطراف سے فاتحانہ حیثیت سے مکّے میں داخل ہوئی۔ ان میں بہت سے وہ لوگ بھی تھے، جنھوں نے دس سال بعد اپنے وطن اور آباؤ اجداد کے گھروں کو دیکھا تھا۔ یہاں آکر وہ پہلے زخم ہرے

ہو گئے۔ کفارِ مکہ کی بدسلوکی، اذیت رسانی اور جسمانی تعذیب کا ایک ایک نقش اُبھر آیا۔ اپنے وطن میں آکر صحابہؓ کو دُنیاوی مال و متاع اور جائداد کی واپسی کا خیال تک نہیں آیا۔ عشقِ رسولؐ ہی اُن کی جائداد اور متاع تھا۔ اس کے ہوتے وہ کسی دوسری چیز کے خواہش مند نہ تھے۔

جب مسلمان مکے میں داخل ہوئے تو شہر کے ایک حصّے میں کافروں نے مزاحمت کی۔ حضرت خالدؓ جس جماعت کے ساتھ تھے، اُس پر ان شریروں نے بے تحاشا تیر برسانا شروع کر دیے، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو بھی جوابی کارروائی کرنا پڑی۔ چند کافر مارے گئے، جن کی تعداد تیرہ سے اٹھارہ تک بیان کی جاتی ہے۔ چند زخمیوں کے علاوہ دو مسلمان بھی شہید ہوئے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اِس حادثے کا علم ہوا تو آپ بہت رنجیدہ ہوئے اور فرمایا "میں نے تو سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ خوں ریزی نہ ہونے پائے۔"

حضورؐ کعبے میں داخل ہوئے اور دستِ مبارک سے خدائے واحد کے گھر کو بُتوں سے پاک کیا۔ کلید برداری کعبۃ اللہ کی خدمت کا بہت بڑا شرف اور معزز منصب تھا۔ حضورؐ نے کلید بردار کو کعبے کی کُنجی واپس کرتے ہوئے فرمایا "یہ ہمیشہ تمھارے اور تمھاری نسل کے پاس رہے گی"۔ چنانچہ آج تک اس خاندان کو کعبے کی کلید برداری کا شرف حاصل ہے۔ پھر آپؐ نے خطبہ دیا:

"اللہ ایک ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ اُس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ اپنے بندے کی مدد کی اور سارے گروہوں کو شکست

دی۔ کسی شخص کو جو خدا اور رسولؐ پر ایمان لایا ہے، جائز نہیں ہے کہ وہ مکّے میں خوں ریزی کرے۔ میں نے زمانۂ جاہلیت کی تمام رسموں کو پائمال کر دیا ہے مگر تولیت اور حاجیوں کو آبِ زمزم پلانے کا انتظام باقی رکھا ہے۔ اے قومِ قریش! جاہلیت کا غرور اور اس نسبت کا افتخار اللہ نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹّی سے بنے ہیں"۔

فتحِ مکّہ کے سلسلے میں سب سے زیادہ سوچنے اور غور و فکر کرنے کی بات یہ ہے کہ آج اُس قوم پر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو پورا اختیار حاصل تھا جو مسلمانوں کے خون کی پیاسی تھی۔ جس نے مسلمانوں کو ہر طرح کے مظالم کے لیے تختۂ مشق بنایا تھا۔ اُنھوں نے اگر مکّہ چھوڑ کر کہیں پناہ لینا چاہی تو ان کا تعاقب کیا تھا اور بادشاہوں کے درباروں میں جا کر ان کے ذلیل کرنے اور انھیں جلاوطن کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب وہ مکّہ چھوڑ کر مدینے چلے گئے تو مدینے کو جو اس دُنیا میں اُن کی آخری پناہ گاہ تھا، تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ جو دردناک اور ظالمانہ سلوک کیا گیا تھا اور جس جس طرح رحمتِ عالم کو ستایا گیا تھا اور وہ جو اَخلاق کے پھول برسا رہا تھا، اُس کے بدلے میں اُس پر پتّھر پھینکے گئے تھے۔ ایسے خوف ناک دُشمن جو انسانیت اور شہریت کے ابتدائی اور فطری حقوق تک مٹا دینے والے اور بے گناہوں پر ہمیشہ ظلم کرنے والے ہوں، اُن کے لیے نرم سے نرم سزا یہ ہو سکتی تھی کہ اُن کے لیڈروں کو سرِ بازار کوڑے لگائے جاتے۔ بعض سنگدل

شرارت پسندوں کو قتل کیا جاتا۔ اُن میں سے بعض کو جلاوطنی کی سزا دی جاتی اور کچھ کو قید خانوں میں ٹھونس دیا جاتا تاکہ اُن کی قوت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتی اور یہ سرپھرے فتنہ پرداز اور خُوں خوار دُشمن پھر سر ہی نہ اُٹھا سکتے ۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی ظہور میں نہیں آئی۔ سزا اور تادیب تو ایک طرف رہی۔ یہاں کسی دُشمن کو ڈرایا اور دھمکایا تک نہیں گیا۔ اُن سے کوئی بازپُرس نہیں کی گئی۔ کسی قسم کی لعنت و ملامت اور سرزنش نہیں کی گئی۔ یہ لوگ کافر، مُشرک اور پرلے درجے کے سنگدل تھے، مگر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے۔ اُنھیں حضورؐ کے حُسنِ سلوک اور شانِ عفو و کرم پر اعتماد تھا۔ اِسی لیے تو اُنھوں نے عرض کیا کہ "آپؐ کریم ہیں اور کریم باپ کے بیٹے ہیں"۔ اس پر رحمۃٌ للعالمینؐ نے فرمایا:

"جاؤ! تم سے آج کوئی بازپُرس نہیں۔ تم سب کے سب آزاد ہو"۔

یہ فرما کر حضورؐ نے اُن سے آئندہ کسی قسم کا عہد و اقرار نہیں لیا، کوئی شرط پیش نہیں فرمائی۔ مہاجرین کی جو جائدادیں کفار کے قبضے میں تھیں، واپس نہیں لیں بلکہ حضورؐ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ "وہ اپنے تمام حقوق چھوڑ دیں"۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے دو مسلمانوں کو قتل کیا اور مکے سے فرار ہو گیا۔ اُس کی بیوی نے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر معافی چاہی۔ یہاں تو رحمت کا دریا جوش میں تھا۔ درخواست کو شرفِ پذیرائی حاصل ہوا۔ بعد میں عکرمہ نے واپس آ کر اسلام قبول کیا اور وہ عکرمہ سے حضرت عکرمہؓ بن گئے۔

ابُوسفیان کی بیوی ہندہ جس نے جنگِ اُحد میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے چچا حضرت حمزہؓ رضی اللہ عنہ کا جگر چبایا تھا، اُسے اور سیدالشہداء حضرت حمزہؓ کے

قاتل وحشیؓ تک کو معاف کر دیا۔ ھبار کو بھی معاف کر دیا حالانکہ اُس نے مکّے سے مدینے جاتے ہُوئے حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو بے دردی کے ساتھ قتل کیا تھا
عفو و درگزر کی تعلیم دینا آسان ہے، لیکن اپنے قاتلوں، ستانے والوں اور بربادی چاہنے والوں کو پُوری طرح غلبہ پانے کے بعد کسی ملامت کے بغیر معاف کر دینا یہ محمدؐ عربی ہی کی شان تھی۔ عفو و درگزر کا اس قدر روشن باب اسلام کی تاریخ کے سوا اور کہیں نہیں ملتا۔

فتحِ مکّہ پر کُفّار حیران تھے کہ اتنی عظیم الشّان فتح پر بھی نہ تاج پوشی کی رسم ادا کی جارہی ہے نہ کسی جشن کی تیاری کا انتظام ہے۔ نہ شادیانے بجتے ہیں اور نہ بیگمات کے محل کا پروگرام نظر آتا ہے۔ بلکہ ہر جگہ سے جہاں کہیں بھی مسلمان ہیں، خداوندِ قدّوس کی حمد و ثناء کی صدائیں گُونج رہی ہیں۔

فتحِ مکّہ کے بعد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اطلاع ملی کہ وادیِ حُنین میں ایک بہت بڑا لشکر جمع ہو رہا ہے جو مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتا ہے تاکہ فتحِ مکّہ سے اُن کو جو تقویت حاصل ہُوئی ہے اُس کا ازالہ اور توڑ ہو جائے۔ جب اس خبر کی اچھی طرح تصدیق ہو گئی تو حضورؐ بارہ ہزار صحابہؓ کے ساتھ جن میں مکّے کے دو ہزار غیر مسلم بھی شامل تھے، وادیِ حُنین کی طرف بڑھے۔ ثقیف و ہوازن اس معرکے میں بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ شریک ہُوئے تھے۔ اسلامی لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہوازن اہم مقامات پر قبضہ جما چکے تھے۔ جب مسلمانوں کا لشکر دُشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنے لگا تو دشمن کی کمین گاہوں میں چھپی ہوئی فوج نے تیر برسانا شروع کر دیئے جس سے مسلمانوں کی فوج منتشر ہو گئی۔ صرف حضورؐ کے ہمراہ ایک مختصر

سی جماعت صحابہؓ کرام کی رہ گئی۔ اس نازک موقع پر حضورؐ نے عزم و استقلال کے ساتھ پُر جلال بلند آواز سے فرمایا

"مَیں نبیؐ ہوں۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں۔ مَیں عبدُالمطلب کا فرزند ہوں" (چاہے فتح ہو یا شکست ہو، غم و اندوہ کا عالم ہو یا مسرت و انبساط کی فضا، مَیں ہر حال میں نبی ہوں۔ میری نبوّت کسی حادثے سے متاثر نہیں ہو سکتی)۔

جو لوگ سراسیمہ، بدحواس اور منتشر ہو گئے تھے، اس آواز کو سُنتے ہی اُن میں حوصلہ پیدا ہُوا اور وہ مجتمع ہو گئے۔ پھر جو اُنھوں نے پورے زور شور کے ساتھ حملہ کیا تو میدانِ جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا۔ اُن کے ایک ہی حملے نے کُفار کے پاؤں اکھیڑ دیے۔ وہ ہزیمت کے داغ دلوں پر لیے ہُوئے میدان سے بھاگ نکلے اور ایسے بھاگے کہ پیچھے بھی مُڑ کر نہ دیکھا۔ اُن کی فوج اب دو حصّوں میں بٹ گئی۔ اُن کا سپہ سالار آزمودہ کار سپاہیوں کو لے کر طائف میں قلعہ بند ہو گیا۔ حضورؐ نے طائف کا محاصرہ کیا مگر بعد میں ایک تجربہ کار بدّو کی رائے کو پسند فرمایا اور محاصرہ اُٹھا لیا۔ اس دوران میں قبیلہ ہوازن کے چھ سرداروں کا وفد، جو بُت پرست تھے، رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہُوا اور رحم کی درخواست کی۔ حضورؐ نے اپنے خاندان والوں کے حصّے کے قیدی چھوڑ دیے، جس کے اتباع اور تقلید میں سب نے اپنے اپنے قیدیوں کو رہائی دے دی۔ حضورؐ نے نہ تو اُن پر اسلام لانے کی شرط لگائی، نہ اُن پر کوئی دباؤ ڈالا اور نہ اُن سے کسی قسم کا عہد لیا۔ اُن قیدیوں میں دائی حلیمہ کی بیٹی بھی

تھی۔ آپؐ اُس کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آئے۔ اُس کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر بچھا دی اور تحائف دے کر رخصت کیا۔ غنیمت کا مال تقسیم کرتے وقت حضورؐ نے قریش اور بعض بدوی سرداروں کے ساتھ فیّاضانہ سلوک کیا۔ اِس پر انصار کے بعض نوجوانوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جب حضورؐ کو اِس کا علم ہُوا تو ایک فوجی جرنیل کی حیثیت سے تنقید کرنے والے فوجی آدمیوں کو سزا دینے یا اُنھیں سرزنش کرنے کے بجائے حضورؐ نے انصار کو اِکھٹا کر کے فرمایا "اے جماعتِ انصار! کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم لوگ گمراہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے میری بدولت تم کو ہدایت عطا فرمائی؟" انصار نے عرض کیا "بے شک! اللہ اور اُس کے رسولؐ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے"۔ پھر آپؐ نے فرمایا "تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دُشمن تھے۔ میری بدولت تم میں اِتّفاق پیدا ہُوا"۔ انصار نے عرض کیا "بے شک! آپؐ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا"۔ پھر آپؐ نے اِرشاد فرمایا "تم لوگ نادار تھے۔ میری بدولت اللہ نے تم کو غنی کیا"۔ انصار نے عرض کیا "بے شک! اللہ اور رسُولؐ کا ہم پر بڑا احسان ہُوا"۔ پھر آپؐ نے فرمایا "تم مجھے یوں جواب دے سکتے ہو کہ ساری دُنیا نے تجھے جھٹلا دیا اور ہم نے تیری تصدیق کی۔ سب نے تم کو چھوڑ دیا اور ہم نے پناہ دی۔ تو محتاج تھا، ہم نے تیری مدد کی اور مَیں تمھاری اِن باتوں کی تصدیق کرُوں گا۔ اے جماعتِ انصار! کیا تم لوگ یہ پسند نہیں کرتے کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لے جاؤ"۔

یہ تقریر سُن کر انصار بے اختیار رو پڑے۔ یہاں تک کہ آنسوؤں سے اُن کی

ڈاڑھیاں تر ہوگئیں۔ اِس تقریر کی سادگی، اثر انگیزی اور نفسیاتی انداز اپنی جگہ اعجاز ہے۔

جب حضورؐ طائف کی طرف سے ہر قسم کے خطرے اور اندیشے سے مطمئن ہو گئے تو عُمرے کی نیّت سے عازمِ مکّہ ہُوئے۔ اِس فریضے سے فارغ ہو کر اپنے ایک صحابیؓ حضرت عتاب بن اُسیدؓ کو جن کی عُمر بیس سال کی تھی، مکّے میں عامل (گورنر) مقرّر فرمایا اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو قرآنِ کریم اور احکامِ دین کی تعلیم کے لیے اُن کے پاس چھوڑا۔ عامل (گورنر) کے لیے ایک درہم روزانہ وظیفہ مقرّر کیا، تاکہ وہ کسی کا دست نگر نہ رہے۔ اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے اُسے دُوسرے کاموں میں مشغول نہ رہنا پڑے اور وہ جمعیّتِ خاطر کے ساتھ حکومت کے فرائض انجام دے سکے۔ عتابؓ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اسلام میں امیر کی حیثیت سے حج ادا کیا۔ اِس موقع پر یہ منظر بھی نظر آتا ہے کہ مسلمان اپنے دینی احکام کے تحت ارکانِ حج ادا کر رہے ہیں اور مشرکین حج میں اپنے قواعد و رسوم برت رہے ہیں۔ کوئی کسی سے تعرّض نہیں کرتا۔ اِس میل جول کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین کو مسلمانوں کی زندگیوں اور اُن کے اعمالِ حسنہ کے مطالعے کا سنہری موقع ملا اور وہ مسلمانوں کی تعریفیں کرنے لگے۔ ہجرت کے آٹھویں سال ۲۴ ذی قعدہ کو حضورؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ مدینے واپس تشریف لائے۔ اِسی سال کے آخری دِنوں میں آپؐ نے لکڑی کا منبر تیار کرایا، جس پر بیٹھ کر خُطبہ ارشاد فرماتے۔ اِسی سال حاکمِ بحرین نے آپؐ کا خط ملنے پر اِسلام قبول کیا۔

اسلام کا چرچا سارے عرب میں ہو چکا تھا اور اللہ کا کلمہ اب وہاں نامانوس

اور اجنبی نہیں رہا تھا۔ عرب کے قبیلوں اور خاندانوں نے اپنے اپنے نمائندے بھیجے اور بعض رؤساء، غلام، یتیم، غرباء اور عورتیں بذاتِ خود مدینے آئیں تاکہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں حالات کا پتہ لگائیں اور خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیں۔ جب یہ لوگ مدینے آکر قیام کرتے اور حضورؐ کو دیکھتے تو بعض لوگ تو دیکھتے ہی بے ساختہ پکار اُٹھتے "خدا کی قسم! یہ چہرہ کسی جھوٹے نبی کا نہیں ہو سکتا" اور اس کے بعد اس نبیؐ صادق و مصدوق کی تصدیق کرتے اور مشرف بہ اسلام ہو جاتے۔ کوئی حضورؐ کی زبانِ وحی ترجمان سے قرآن کی چند آیتیں سُنتا اور ایمان لے آتا ہے۔

یہ لوگ مدینے میں دیکھتے کہ محمدِ عربی علیہ السّلام کو مُلکِ عرب کی حکومت وسلطنت حاصل ہو چکی ہے مگر اس پر بھی مسجد کی چٹائی آپؐ کا تخت اور پُرانا عمامہ آپؐ کا تاج ہے۔ آپؐ ہر قوم کے ہر فرد کو کسی امتیاز کے بغیر عزت و احترام سے مخاطب کرتے ہیں۔ ایسے جاں نثار فرماں برداروں کی موجودگی میں جو آپؐ کے چشم و ابرو کے اشارے کے منتظر رہتے ہیں، آپؐ اپنی جُوتیاں خود گانٹھتے ہیں۔ پھٹے کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگاتے ہیں۔ بکریوں کا دُودھ دوہتے ہیں۔ لوگوں کا کام کاج اپنے ہاتھ سے کر دیتے ہیں۔ حکومت کا والی، مگر گھر کی کل کائنات بان کی بنی ہوئی ایک چارپائی ہے، جس کے نشان جسمِ اطہر پر اُبھر آتے ہیں اور ایک گدا ہے جس میں کھجور کے پتّے بھرے ہوئے ہیں۔ گھر سے کئی کئی دن دھواں نہیں اُٹھتا۔ کئی کئی وقت کے فاقے ہوتے ہیں۔ کھجور اور ستو، یہ عام خوراک ہے۔ وہ بھی پیٹ بھر کر کہاں میسّر آتی ہے۔ نوکر چاکر نہیں، زیب و زینت اور عیش و راحت کا سامان نہیں۔ ٹھاٹ باٹھ اور کرّوفر نہیں۔ سیدھی

سادی اور انتہائی سادہ زندگی۔ بناوٹ سے دُور۔ طمطراق سے پاک۔ اس پر جُود و عطا اور بخشش و سخاوت کا یہ عالم کہ کوئی سائل درِ اقدس سے خالی ہاتھ واپس نہیں ہوا۔ ایسا بھی ہوا کہ سائل آیا اور گھر میں تھوڑی سی کھجُوروں کے علاوہ کھانے کی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ سائل کو کھجُوریں عطا کر دیں اور نبیؐ کے گھر میں فاقہ رہا۔ ایک ضرورت مند حاضر ہوتا ہے، اس وقت دینے کے لیے ایک درہم بھی نہیں ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں " کہ تم میرے نام پر کسی سے قرض لے لینا "۔ لُطف و کرم کا یہ دائرہ اِنسانوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ بے زبان حیوانات بھی اس سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ بلی پناہ لینے کے لیے دروازہ ہلاتی ہے تو خود اٹھ کر دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اپنی سواری کی پیٹھ اپنے ہاتھ سے مَلتے اور سہلاتے ہیں۔ ایک شخص چڑیا کے انڈے اُٹھا لیتا ہے اور چڑیا بے قرار منڈلاتی دِکھائی دیتی ہے۔ آپؐ کی نظر اس پر پڑتی ہے تو فرماتے ہیں " اس کو کس نے اذیّت پہنچائی "۔ جب وہ شخص اپنی غلطی کا اقرار کر لیتا ہے تو اُس کو حکم دیتے ہیں کہ اُس کے انڈے اُسی جگہ رکھ دو اور بے زبانوں کے بارے میں خدا سے ڈرتے رہو "۔ ایک بدّو کے اُونٹ کو بلبلاتا دیکھ کر اُس کے مالک کو خدا کا خوف دِلاتے ہیں کہ قیامت میں اس کی بازپُرس ہوگی۔

ہر کسی کی داد فریاد، گزارش اور عرضداشت سُننے کے لیے ہر وقت مستعد رہتے ہیں۔ عدل و انصاف کے معاملے میں کسی کے ساتھ ذرّہ برابر رُو رعایت رَوا نہیں رکھتے۔ بچّوں سے محبت کا یہ عالم کہ ایک زانُو پر اپنے نواسے حسنؓ کو (جو نہایت حسین و جمیل ہونے کی وجہ سے حسنؓ کہلاتے تھے) بٹھائے ہُوئے ہیں اور دُوسرے

زانو پر اُسامہؓ کو (غُلام کا لڑکا حبشی عَورت کے بطن سے ہونے کی وجہ سے حبشی خد و خال رکھتا تھا) بٹھار کھاہے اور دونوں کو ایک ہی جذبے کے ساتھ پیار کرتے اور دُعائیں دیتے ہیں۔ انصارِ مدینہ کا ایک فرد مالی اِعانت کے لیے سوال کرتا ہے تو آپؐ فرماتے ہیں "محنت اور مزدُوری مانگنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ یہ اچھا نہیں کہ قیامت میں چہرے پر داغِ گدائی لے کر جاؤ۔"

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُخلاقِ محمُودہ اور صفاتِ حمیدہ میں ذرّہ برابر تصنّع اور نمائش نہیں پائی جاتی۔ فطرت کے عین مطابق آپؐ بہ یک وقت حکومت کے فرماں روا، سپہ سالار، رسُولِ برحق اور ہادیٔ اعظم ہیں۔ مگر ایک سیدھے سادے عام آدمی کی طرح آپؐ کے پاس ہر کس و ناکس، امیر و غریب، تعلیم یافتہ اور جاہل۔ مہذب اور گنوار، شہری اور دیہاتی مرد اور عورت بچّے بُوڑھے آزاد اور غُلام سب بلا کسی روک ٹوک کے آتے ہیں۔ سوالات کرتے ہیں۔ مسائل پُوچھتے ہیں۔ اپنے دل کی بات کہتے ہیں۔ آپؐ کی بات سُنتے ہیں اور پھر آپؐ کا کہنا، کرنا، قول و فعل، اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، ہنسنا بولنا، کھانا پینا، شکل و شباہت، طور و طریق، یہاں تک کہ ایک ایک حرکت و ادا اور لب و لہجہ تک کو آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ اور مخلص و پاک باز رفقاء محفوظ کرتے جاتے ہیں۔ کسی اِنسانی شخصیت کا تو ذِکر ہی کیا، دُوسرے مذاہب کی آسمانی کتابوں اور الہامی صحیفوں کی حفاظت کا بھی اِس قدر اہتمام نہیں کیا گیا ہوگا۔

جو لوگ اِسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے مدینے آتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ زبان سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اِقرار کرتے، حضورؐ کو اللہ کا

رسولؐ مانتے اور دونوں باتوں کا سچے دل سے یقین کرتے ہی ہر انسان اس عالمگیر برادری میں شامل ہو جاتا ہے، ان کی عبادت کا مفہوم اتنا وسیع اور جامع ہے کہ ہر وہ حرکت جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنا ہے، عبادت میں شامل ہے ــــ "صلوٰۃ" اللہ کے حضور عجز و نیاز پیش کرنے اور توجہ الی اللہ کا نام ہے۔ نماز ادا کرنے کے لیے جسم کی پاکی، صفائی اور نظافت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عملی تعلیم ہے نماز پڑھتے میں ہر شخص کعبے کی سمت اپنا مُنہ کرتا ہے۔ اس عمل میں کتنی تنظیم اور مرکزیت پائی جاتی ہے مگر کعبے کو صرف سمت قرار دیا گیا ہے۔ اُس کی عبادت نہیں کی جاتی، کیونکہ ان کے دِلوں میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت کا یقین جاگزین ہے۔ وہ کعبے کی نہیں اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش بیان کرتے ہیں۔ اللہ ہی سے دعائیں مانگتے ہیں اور اُسی کو حاجت روا، مشکل کُشا اور فریاد رس سمجھتے ہیں۔ نماز جماعت کے ساتھ ادا ہو رہی ہے۔ کس قدر استغراق، توجہ اور یکسُوئی ہے۔ اُمراء غُرباء کے دوش بدوش کھڑے ہیں۔ مساوات کا اس سے زیادہ موثر عملی درس اور کیا ہو گا۔ آدمی دن میں کئی بار کھاتا پیتا ہے تاکہ جسم میں کمزوری پیدا نہ ہو، قویٰ مضبوط اور کام کے قابل رہیں۔ یہ پانچ وقت کی نماز رُوح کی غذا ہے تاکہ جسم اور رُوح کے نظام ایک دُوسرے سے متصادِم اور مزاحم نہ ہوں نفس کی پاکیزگی کے لیے روزے رکھتے ہیں۔ حج میں اُونچ نیچ اور امیر و غریب کے امتیاز کو مٹانے کے لیے ایک سا لباس پہنتے ہیں۔ یہ حجرِ اسود ہے۔ یہ مُلتزم ہے۔ یہ صفا و مروہ ہے۔ یہ عرفات ہے۔ یہ مُزدلفہ و منیٰ ہیں۔ ہر جگہ ارکانِ حج میں یکسانی پائی جاتی ہے اور ہر رُکن ادا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔

دُنیا میں امن و امان برقرار رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا سبق دے کر ساری قوموں کے پیغمبروں کی دل سے تعظیم و تکریم کرنا ضروری قرار دیتے ہیں اور کسی رسُول اور نبیؑ کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے تعصب ختم ہو چکا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ اور تربیت کردہ صحابیؓ انسان ہیں، فرشتے نہیں ہیں۔ ان سے بہ تقاضاے بشریت غلطی بھی ہو جاتی ہے مگر وہ غلطی پر جمتے نہیں۔ فوراً اپنی غلطی اور خطا پر شرمسار اور تائب ہو کر۔ آیندہ نہ کرنے کا عہد کر کے نئی زندگی کا آغاز کر دیتے ہیں۔ تقویٰ کو انسانی عظمت کا معیار قرار دے کر ایک انسان کو دوسرے انسان پر حسب نسب، قومیت اور ثروت سے جو برتری حاصل ہوتی ہے، اُسے ختم کر دیا گیا ہے۔ ایسا عدل و انصاف کہیں دیکھنے ہی میں نہیں آیا۔ اس نے حقیقی امن کی بُنیاد رکھ دی ہے۔ اسراف و تبذیر سے دور رہتے ہیں یعنی نہ تو ایسی جگہ خرچ کرتے ہیں جہاں خرچ نہیں کرنا چاہیے تھا اور نہ فضول خرچی سے کام لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے پاس اگر کوئی چیز ضرورت سے زیادہ ہو تو اُسے دوسرے کو پیش کر دیتے ہیں۔ ان میں لالچ اور دُنیا کمانے کی ہوس نہیں۔ قناعت کو سب سے بڑی دولت سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے حقوق کو پوری ذمّے داری اور ایمان داری کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور اس میں کوتاہی کو خیانت سمجھتے ہیں۔ دین کے مُعاملات میں تو ہر فرد یہی چاہتا ہے کہ ساری بھلائیاں اور نیکیاں سمیٹ لے۔ مگر دُنیوی معاملات میں ان کے یہاں ایک دوسرے کے مقابلے میں مسابقت کا جذبہ نہیں پایا جاتا۔ اس چیز نے ان کے درمیان انتہا درجے کا میل ملاپ اور محبت و اخوت پیدا کر دی ہے۔

شراب، جُوا، بدکاری اور بے حیائی ایسے افعالِ شنیعہ ہیں، جن سے انسانی زندگی کے چار پہلو : پاکیزگیِ نفس و کردار، عزت، دولت اور صحت یا ان میں سے کوئی ایک چیز ضرور متاثر ہوتی ہے۔ یہ لوگ اُن کے پاس بھی نہیں پھٹکتے۔ ان کے فضل و کرم کا دریا کسی امتیاز کے بغیر سب کو سیراب کرتا ہے۔

مدینے میں جو وفود آتے، ان کے امراء اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے کہ اسلام کی تعلیمات انقلابی روایات کے برخلاف غریب اور امیر طبقے کے درمیان تصادم نہیں ہونے دیتیں۔ ان کے دولت مند ناشکر گزار اور مغرور نہیں اور اُن کے غریب بھیک منگے اور امیروں کے زوال نعمت کی تمنا کرنے والے نہیں ہیں۔ اسلام نے ان دونوں طبقوں کی اصلاح کی ہے۔

اُمراء کی عزت و تکریم کا لحاظ رکھتے ہوئے اُن کے مال میں سے زکوٰۃ کی رقم وصول ہوتی ہے جو غریبوں اور معاشرے کی فلاح و بہبود پر اس طرح صرف کی جاتی ہے جس سے اقتصادی بدحالی اور جرائم کے رُجحان کا انسداد ہوتا ہے اور ساتھ ہی دولت کے استعمال کا توازن بگڑنے نہیں پاتا۔ وہ بے نفس تو نہیں، مگر نفس کے محکوم نہیں، حاکم ہیں۔ اس معاشرے میں غریبوں کی عزت نفس مجروح نہیں ہونے پاتی۔ تقویٰ کو عزت و برتری کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ جو بغیر دولت کے حاصل ہو سکتی ہے۔

غلام دیکھتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں آقا اپنی جیسی خوراک اور پوشاک غلاموں کو بھی دیتے ہیں۔ ان کو کسی ایسے لقب، نام اور نسبت سے نہیں پکارا جاتا جس میں اہانت اور تحقیر کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ غلام کو کنبے کا ایک فرد سمجھا جاتا ہے۔ بعض گناہوں

کے کفارے میں غلام آزاد کیے جاتے ہیں۔ غلاموں کو یہ موقع بھی دیا گیا ہے کہ وہ اپنی کمائی سے آزادی حاصل کر لیں۔ بیت المال بھی ان کو آزاد کرانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ غلامی کی رسم یک قلم منسوخ نہ کر کے غلاموں پر در اصل احسان کیا گیا ہے اور وہ اس طرح فاقہ کشی اور بے روزگاری کی مصیبتوں اور ان کی وجہ سے جرائم میں مبتلا ہونے سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ یہاں "غلام" ذلیل نہیں معزز ہے اور آقاؤں کا غلاموں کے ساتھ برابری کا برتاؤ ہے۔

باہر سے آئی ہوئی عورتیں دیکھتی ہیں کہ عورت کو ذلت و پستی سے نکال کر مردوں کی طرح انسانی وقار کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق دیا گیا ہے۔ لامحدود شادیوں کو محدود کر دیا گیا ہے۔ عورتوں کا وراثت میں حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ یہ فرما کر کہ "ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے" ماں کا رتبہ کس قدر بلند کیا گیا اور مرد و زن دونوں طبقوں پر ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ ایک دوسرے کے لیے تسکین و آرام کا سبب بنیں۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں کی اس طرح پردہ پوشی کریں اور ایک دوسرے کے اخلاق کو اس انداز میں خوش نما بنا کر پیش کریں، جس طرح لباس پردہ پوشی بھی کرتا ہے اور جسم کو زیب و زینت بھی دیتا ہے آپس میں تعلقات خوش گوار نہ رہنے کی صورت میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کی سہولت دی گئی ہے۔ یہ معاشرہ عورت کی عزت، عظمت اور اس کی شخصیت کی پوری طرح حفاظت اور نگرانی کرتا ہے۔ عورتوں کی تبلیغ و رہنمائی کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ کی ایک جماعت موجود ہے جو عورتوں کے ذاتی اور گھریلو معاملات اور مسائل میں دینی نقطہ نگاہ

سے رہنمائی فرماتی ہیں اور ان کو ایسی باتیں بتاتی ہیں جو وہ صرف اپنی ماؤں سے کہہ سکتی ہیں۔ عورت کو یہاں کے مُعاشرے میں عزت و شرف کا فطری مقام عطا کیا گیا ہے۔

وفُود مدینے میں آکر مسجدِ نبوی کو دیکھتے ہیں کہ کچّی دیواریں، کچّا فرش، کھجور کے تنوں کے ستون اور اُس کے پتّوں اور ٹہنیوں کی چھت۔ یہ عبادت گاہ بھی ہے، ایوانِ حکومت بھی ہے۔ وفود بھی یہاں ٹھہرائے جاتے ہیں۔ یہ عدالت بھی ہے اور درس گاہ بھی۔ جہاں کوئی حکمرانی اور جہاں بانی کی تعلیم پا رہا ہے، کوئی فنونِ جنگ کا سبق لے رہا ہے۔ کوئی قرآن اور احکامِ دین کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یہاں نمازیں بھی ادا کی جا رہی ہیں اور مقدمات کے فیصلے بھی ہو رہے ہیں۔ یہ علومِ قرآنی کی یُونیورسٹی بھی ہے اور مبلّغِ دین کا مرکز بھی۔ اس درس گاہ کے طالب علموں پر اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ غالب ہے جو کچھ سنتے، پڑھتے اور سیکھتے ہیں اُس پر لفظاً لفظاً عمل کرتے ہیں۔ ان پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ حصولِ علم کی حیثیت عبادت کے قریب قریب ہے۔ عورتیں اپنے جداگانہ دائرے میں رہ کر وعظ و تربیت سے فائدہ اٹھاتی ہیں، خصوصاً ازواجِ مطہراتؓ کے علم و عمل سے استفادہ کرتی ہیں۔

اسی سال مدینے میں عیسائیوں کا ایک وفد آیا۔ حضورؐ نے اس وفد کو مسجدِ نبوی میں اُتارا اور اُن کے مذہب کے مطابق اُنھیں عبادت کرنے کی اجازت عطا کی۔ ایک وفد اہلِ طائف کے سرداروں کا بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا اور عرض کیا کہ ان کی جاہل اور توہم پرست عورتیں بُتوں کی تباہی کو گوارا نہیں کریں گی، اس لیے ان کے بُتوں کو نہ چھیڑا جائے۔ اُن کو یونہیں رہنے دیا جائے۔ ان لوگوں نے یہ درخواست اس امید پر کی تھی کہ جس

طرح تاریخ کے پہلے انقلابات کی کامیابی کا انحصار اس دور کے معاشرے سے کسی نہ کسی نوعیت کے سمجھوتے پر ہوتا تھا اور طرفین میں سے دونوں ایک دوسرے کی جانب جھکتے تھے۔ یہاں بھی یہی ہوگا۔ اُن بے چاروں کو نہیں معلوم تھا کہ یہ انقلاب اپنی کامیابی کے لیے معاشرے کے ساتھ کسی قسم کے سمجھوتے اور سودے بازی کا محتاج نہیں ہے۔ یہ انقلاب تو معاشرے کی ہر برائی کے لیے پیغامِ فنا ہے۔ اس کے سامنے برائیاں ٹھہر نہیں سکتیں۔ چنانچہ حضورؐ نے اُن کی درخواست کو رد کر دیا۔ اِس پر اُنھوں نے صرف ایک ماہ کی مہلت چاہی۔ حضورؐ نے اسے بھی نامنظور فرمایا اور اپنے صحابہؓ کو طائف بھیجا جنھوں نے وہاں کے تمام بتوں کو توڑ ڈالا۔ اہلِ طائف اس توہم اور غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ان کے بتوں کو جو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا وہ کوئی نہ کوئی مصیبت اور نقصان ضرور اٹھائے گا۔ صحابۂ کرامؓ کے بدعت شکن تیشوں نے ان لوگوں کے اس وہم و جہالت کا اس طرح قلع قمع کر دیا۔

جب اسلام کی کامیابی اور روز افزوں ترقی کا چرچا دور دراز ملکوں تک پہنچا تو عرب قبائل کی طرح یہ ممالک بھی خطرہ محسوس کرنے لگے کہ اس نئی تحریک کی زد ان کے اقتدار پر پڑے گی، جس سے اُن کی آن بان مٹی میں مل جائے گی۔ چنانچہ جنگِ موتہ کی شکست کا بدلہ لینے کا بہانہ تراش کر غسانی بادشاہ نے کثیر تعداد میں فوج جمع کی اور ہرقل روم سے بھی امداد طلب کی۔ ابُو عامر راہب مکّے سے روم پہنچا اور قیصرِ روم کو شاہِ غسان کی مدد کے لیے اُکسایا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس خبر کی تصدیق ہو چکی تو آپؐ نے عام مسلمانوں کو مدینے آنے کی دعوت دی کہ تمام مُلک

عرب کی آزادی اور سالمیت خطرے میں ہے اور معاندین خود اسلام پر ضرب لگانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اِس دعوت پر اَطراف و اکناف سے آ آکر مسلمان مدینے میں جمع ہو گئے۔ ہرقلِ روم نے منافقینِ مدینہ سے ساز باز کر رکھی تھی جو روزانہ خفیہ مجلسیں منعقد کرتے اور ان میں مسلمانوں کے خلاف منصوبوں اور سکیموں پر غور و فکر اور بحث و گفتگو ہوتی۔ منافقین نے مسلمانوں میں تفرقہ اور نا اتفاقی پیدا کرنے کے لیے اپنی جُداگانہ مسجد بھی بنائی تھی۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تمام صحابہؓ کو جنگ کے لیے تیاری اور مالی امداد کرنے کا حکم دیا۔ صحابہؓ نے بڑی فیّاضی، دریادلی اور جذبہ و ایثار کے ساتھ جس قدر اُن سے بن پڑا، اِس مُہم کے لیے چندہ دیا۔ بالآخر رجب کے مہینے میں ہجرت کے نویں سال آپؐ تیس ہزار لشکر کے ساتھ مدینے سے روانہ ہوئے۔ حضرت محمّد بن سلمہ انصاریؓ کو مدینے کا عامل (گورنر) مقرر فرمایا اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ کو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے لیے مدینے میں چھوڑا۔ ہرقل کو جب پتہ چلا کہ تیس ہزار جاں باز اور سرفروش بڑھے چلے آرہے ہیں تو وُہ خوف زدہ اور دل برداشتہ ہو کر میدانِ جنگ سے پیچھے ہٹ گیا۔

مدینے سے چودہ منزل کی مسافت پر تبوک کے مقام پر رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ و سلّم نے اسلامی لشکر کے ساتھ بیس دن تک قیام فرمایا۔ متعدد علاقائی حاکموں نے صلح کی پیش کش کی جسے بارگاہِ نبوت سے شرفِ منظوری حاصل ہوا۔ جب حضورؐ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے تو اہلِ طائف نے جو اسلام کی خوبیوں سے بہت کچھ واقف ہو چکے تھے، اپنا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں بھیجا اور یہ لوگ مدینے آکر حلقۂ اسلام

میں داخل ہو گئے۔ سارا عرب اگرچہ مطیع ہو چکا تھا مگر بعض قبائل میں اب بھی جاہلیت کے اثرات باقی تھے۔ یہی سبب تھا کہ بعض مقامات پر شرارتیں سر اٹھاتی رہیں جن کو فرو کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دستے بھیجے جاتے رہے۔ قبیلۂ طے میں جب بغاوت رُونما ہوئی تو حضرت علیؓ کو اُن کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا اور اس فتنے کو کچل دیا گیا۔ باغی قیدیوں میں مشہورِ بہ سخاوت حاتم طائی کی بیٹی بھی آئی۔ اس کا بھائی شام کے علاقے کی طرف بھاگ گیا تھا۔ حضورؐ نے حاتم کی بیٹی کے آزاد کیے جانے کا حکم دیا۔ اس لڑکی نے عرض کیا کہ میں تنہا رہائی نہیں چاہتی۔ میرے ساتھ دوسری عورتوں کو بھی رہا کیا جائے۔ حاتم کی بیٹی سے اسی مروّت و ایثار کی توقّع تھی۔ اس پر حضورؐ نے سب قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس حُسنِ سلوک کا اثر یہ ہوا کہ یہ لڑکی اسلام لائی اور رہائی حاصل کرتے ہی اپنے بھائی کے پاس شام پہنچی اور اسے سارا ماجرا سنایا۔ اس کے بھائی کے دل میں بھی اسلام گھر کر گیا اور اس نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ کعب عرب کا مشہور شاعر تھا۔ اس کی شاعری کی چاروں طرف دھوم تھی۔ وہ دورِ جاہلیت میں اسلام کی ہجو میں شعر کہا کرتا تھا، وہ بھی مسلمان ہوا اور حضورؐ کی مدح میں وہ اشعار کہے جو اسے زندہ جاوید کر گئے۔

عبداللہ بن اُبَی کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ شخص مدینے کے منافقوں کا سرغنہ تھا۔ اسلام کی دشمنی اور بیخ کنی میں اس نے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ چھپ چھپ کر سازشیں کرنا اور اسلام کے خلاف ہر فتنے کو ہوا دیتا۔ باپ اور بیٹے کے حالات کا یہ تضاد کہ باپ رئیس المنافقین اور بیٹا مومن صادق۔ عبداللہ بن اُبَی کے اس مسلمان بیٹے

نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے باپ کو اپنے ہاتھ سے قتل کردوں کیونکہ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کوئی دوسرا مسلمان میرے باپ کو قتل کر دے تو کہیں میں جوشِ غیرت میں آکر اپنے باپ کے خون کے بدلے میں اسے نہ مار ڈالوں"۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا "نہیں نہیں، میں تمھارے باپ کو قتل کرانا نہیں چاہتا بلکہ اُسے موقع دوں گا کہ وہ اپنی اصلاح کرے"۔ مگر عبداللہ بن اُبَی اپنی عادت سے باز نہ آیا اور وہ برابر اسلام کی دشمنی میں کوشاں رہا اس کے مقابلے میں رحمۃ للعٰلمین کا حُسنِ سلوک، رواداری اور شانِ کرم دیکھیے کہ وہ مرتا ہے تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھاتے ہیں اور اپنا مبارک کرتا اُس کے کفن کے لیے عنایت فرماتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے دین کی صرف تبلیغ ہی کے لیے نہیں بلکہ اسے عملاً نافذ کرنے کے لیے دُنیا میں تشریف لائے تھے۔ حدُود اللہ کا اجراء آپؐ کے فرائض میں داخل تھا۔ اس معاملے میں نہ کسی کے ساتھ رعایت کی جاتی اور نہ کسی کی سفارش قبول ہوتی۔ ایک معزز قبیلے کی عورت چوری کے جرم کی مرتکب ہوئی۔ آپؐ نے ثبوتِ جرم کے بعد اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ بعض شرفائے قریش اس حکم سے کبیدہ خاطر ہوئے۔ انھوں نے چاہا، سعی و کوشش کر کے اس عورت کو سزا سے بچالیں۔ اب سوال یہ درپیش تھا کہ سفارش کون کرے؟ آخر حضرت اُسامہ بن زیدؓ کو اس کے لیے تیار کیا۔ جب اسامہؓ نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر سفارش کی تو چہرۂ مبارک غصے سے سُرخ ہو گیا اور فرمایا "اے اسامہؓ! تم اللہ کی مقرر کردہ سزاؤں میں

سفارش کو دخل دیتے ہو"۔ پھر آپؐ اُٹھے اور لوگوں کو مخاطب کر کے تقریر فرمائی:

"اے لوگو! تم سے پہلے قومیں اسی لیے تباہ ہو گئیں کہ جب ان میں کا کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور چوری کرتا تھا تو اسے سزا دیتے تھے۔ خدا گواہ ہے اگر میری بیٹی فاطمہؓ نے چوری کی ہوتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹ ڈالتا۔"

تبوک سے واپسی پر مدینے میں وفود کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ عرب کے قبیلوں پر قبیلے آ آ کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ حج کا موسم آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کو امیرِ حج بنا کر تین سو صحابہؓ کے ہمراہ مکے روانہ کیا اور حضورؐ نے قربانی کے لیے بیس اُونٹ بھی ساتھ کر دیے۔ حضرت ابوبکرؓ کی روانگی کے بعد قرآن کے احکامات نازل ہوے کہ:

"نہ تو مشرکین مسجدِ حرام کے قریب جائیں۔ نہ برہنہ ہو کر طواف کریں۔"

حضورؐ نے حضرت علیؓ کو ان احکامات کے اعلان اور تبلیغ و اشاعت کے لیے مکہ روانہ فرمایا۔ حضرت علیؓ نے ان احکامات کا اعلان کیا اور حضرت ابوبکرؓ کی قیادت میں مسلمانوں کو فریضۂ حج ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

جب اسلامی حدود ریاست میں نظم و نسق بحال ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے دسویں سال ذی قعدہ کے مہینے میں مدینۂ منورہ سے حج بیت اللہ شریف کے لیے روانہ ہوے۔ مہاجرینؓ، انصار اور رؤسائے عرب کی کثیر تعداد آپؐ کے ہمراہ تھی۔ حاجیوں کا یہ مقدس قافلہ جس کے امیر خود رسالت مآبؐ تھے، ۴ ذی الحج کو

مکّے میں داخل ہُوا۔ حضورؐ نے لوگوں کو مناسکِ حج کی تعلیم دی اور اُونٹنی پر سوار ہو کر میدانِ عرفات میں آخری خطبہ دیا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار عقیدت مندوں اور فرماں برداروں کا مجمع آپؐ کا فرمان سُننے کے لیے ہمہ تن گوش تھا۔ جو لوگ خطبے کے جملوں کو سنتے، وہ دُوسروں تک پہنچاتے اور سنانے کے لیے ان جملوں کو بلند آواز سے دُہراتے۔ حضورؐ نے فرمایا جو لوگ یہاں موجُود نہیں ہیں، ان کو سُننے والے یہ پیغام پہنچا دیں۔

حمد و ثناء کے بعد ارشاد فرمایا :-

"لوگو! میری باتوں کو غور سے سُنو، کیونکہ میں آئندہ سال یا اس کے بعد اس مقام پر تم سے ملنے کا یقین نہیں رکھتا۔ لوگو! جیسا کہ یہ دن اور یہ مہینہ حُرمت والا ہے، اسی طرح ایک دوسرے کا جان و مال تم پر حرام ہیں (یعنی مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت ہر مسلمان کو کرنی چاہیے)۔ امانتیں ان کے مالکوں کے سپُرد کرنی چاہییں۔ دوسروں پر ظلم نہ کرو تاکہ تم پر بھی ظلم نہ کیا جائے۔ سُود حرام ہے۔ شیطان اس سرزمین میں اپنی پرستش سے مائُوس ہو گیا ہے۔ لیکن یہ ہو گا کہ اس کی اطاعت چھوٹے چھوٹے امُور میں کی جائے گی۔ لہٰذا تم شیطان کی اطاعت سے بچو۔ اے لوگو! عورتوں کا تُم پر حق ہے، جیسا کہ تمھارا حق ان پر ہے۔ عورتوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ تمھیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمھارے اعمال کے بارے میں سوال فرمائے گا۔ خبردار!

خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا۔ لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی اور اُمت پیدا ہونے والی ہے۔ خوب سن لو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ پنجگانہ نماز ادا کرو۔ رمضان کے مہینے میں روزے رکھو۔ اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو۔ تمام مسلمان محکوم ہوں یا آزاد، یکساں ذمہ داریاں اور حقوق رکھتے ہیں۔ اعمالِ دین کے سوا کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ تم اپنے غلاموں کو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور انھیں وہ لباس پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ ان پر نہ کوئی ظلم کرو اور نہ ان کا کوئی حق چھینو۔"

پھر حضورؐ نے آسمان کی طرف مُنہ کر کے تین بار فرمایا "اے پروردگار! تو گواہ رہنا، مَیں نے تیرا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا۔" لوگوں نے اس پر بلند آواز سے کہا "ہاں، بے شک آپؐ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا۔"

علالت اور وصال

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم فریضۂ نبوت ادا فرما چکے تھے۔ دین ہر جہت سے مکمل ہو چکا تھا۔ اب دُنیا میں حضوؐر کی تشریف آوری کا مقصد پُورا ہو چُکا تھا۔ اسی سال ماہِ صفر میں ہجرت کے گیارھویں سال آپؐ کو بخار آیا اور برابر بڑھتا رہا۔ آپؐ کی بیماری کی خبر مشہور ہُوئی تو بعض مفسدوں اور شریروں نے سر اٹھایا اور جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا۔ اِن احمقوں نے یہ سمجھا کہ جس طرح حضوؐر کامیاب ہُوئے ہیں، ہم بھی اعلانِ نبوت کے بعد کامیاب ہو جائیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضوؐر کی نبوّت پر صداقت کی ایک اور مُہر ثبت کر دی کہ یہ مدعیانِ نبوت سب کے سب ذلیل و ناکام ہوے۔ نبیؐ آخر ہی کے ذکر کو قیامت تک کے لیے رفعت و سر بلندی نصیب ہوئی۔

ہجرت کا گیارھواں سال اور ماہِ صفر کی چھبیس تاریخ تھی۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بیماری سے کسی قدر افاقہ ہوا تو شام و فلسطین کی سرحدوں پر اضطراب کی خبریں سُن کر مسلمانوں کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا۔ اُسامہ بن زیدؓ کو جو آزاد کردہ غلام، زیدؓ کے فرزند تھے۔ سالارِ لشکر مقرّر فرمایا اور اٹھائیس صفر کو بیماری کی حالت میں

حضرت اُسامہؓ کا جھنڈا اپنے دستِ مبارک سے درست فرماکر فوج کو رخصت کیا۔ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ حضرت اُسامہؓ کی ماتحتی میں اس لشکر میں شامل تھے۔ اُسامہؓ نے مدینے سے چل کر تھوڑی دُور مقام جرف میں قیام کیا حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ حضورؐ کی تیمارداری کے لیے مدینے میں رہ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جناب اُسامہؓ امیرِ لشکر سے اجازت لے کر حضورؐ کی عیادت کے لیے آتے جاتے۔

بیماری روز بروز بڑھتی گئی۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہراتؓ سے اجازت لے کر حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرے میں قیام فرمایا۔ پھر باہر آکر مسلمانوں کے مجمع میں تقریر فرمائی:

"مَیں تمھیں اللہ سے ڈرنے کی ہدایت کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمھیں ہدایت دے۔ میں تمھیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ مَیں تم کو دوزخ سے ڈرانے والا اور جنّت کی بشارت دینے والا ہوں۔ اللہ کے بندو! غرُور اور تکبّر اختیار نہ کرنا۔ جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو تکبّر اختیار نہیں کرتے۔ آخرت کی بھلائی متقیوں کے لیے ہے اور غرُور کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنّم ہے"۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنی جگہ مسجد میں نمازوں کی امامت کے لیے ارشاد فرمایا۔ حضرت عائشہؓ نے اس پر عرض کیا "میرے باپ اس خدمت کو انجام نہیں دے سکیں گے۔ وہ بہت زیادہ رقیق القلب ہیں"۔ حضورؐ نے فرمایا "نہیں، ابوبکرؓ ہی امامت کریں گے"۔ حضرت ابوبکرؓ مسجد میں نماز

پڑھا رہے تھے کہ حضورؐ کو قدرے افاقہ ہوا اور آپؐ مسجد میں تشریف لے گئے۔ ابوبکرؓ پائے مبارک کی آہٹ سن کر پیچھے ہٹے۔ آپؐ نے اشارے سے روکا اور پھر حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی۔ اس نماز کی صورت یہ تھی کہ آپؐ کو دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر دوسرے لوگ ارکانِ صلوٰۃ ادا کرتے جاتے تھے۔

حضورؐ کی طبیعت جو سنبھلی تھی تو یہ درحقیقت افاقۃ الموت (سنبھالا) تھا۔ حالت پھر تشویش ناک ہوگئی مگر پھر تھوڑا سا افاقہ ہوا تو صحابہؓ کو طلب فرمایا اور کہا:

"جب وفود آئیں تو ان کو صلہ و انعام سے ضرور خوش کیا کرنا۔ مشرکین کو جزیرۃ العرب سے بالکل خارج کر دینا۔ اسامہؓ کے لشکر کو ضرور روانہ کر دینا۔ انصار سے نیک سلوک کرنا اور ان کی غلطیوں سے درگزر کرنا"۔

بیماری بڑھتی گئی اور جب وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت عائشہؓ سے فرمایا "گھر میں مال ہو تو خیرات کر دیا جائے"۔ گھر کی کل پونجی پانچ درہم نکلے، جنہیں خیرات کر دیا گیا۔

بارہ ربیع الاوّل دوشنبے کے دن حجرۂ مبارک سے جو مسجدِ نبوی سے متصل تھا، پردہ اٹھا کر دیکھا تو صحابہؓ فجر کی نماز میں خشوع و خضوع کے ساتھ مشغول تھے۔ یہ منظر دیکھ کر حضورؐ فرطِ مسرت سے مسکرا دیے۔ مسلسل علالت کے سبب نقاہت بہت ہوگئی تھی۔ حضرت عائشہؓ کا سہارا لے کر لیٹ گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ ایک تازہ مسواک ہاتھ میں لیے ہوئے حاضر ہوئے تو حضورؐ اسے غور سے دیکھنے لگے۔ حضرت عائشہؓ

مزاج شناس تھیں۔ سمجھ گئیں کہ حضورؐ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا بھائی کے ہاتھ سے مسواک لے کر اپنے دانتوں سے خوب نرم کی۔ پھر حضورؐ کو پیش کی۔ حضورؐ نے دندانِ مبارک میں مسواک کی۔ آپؐ کے پاس پانی کا بھرا ہُوا پیالہ رکھا تھا۔ آپؐ اس میں ہاتھ ڈبوتے اور چہرۂ مبارک پر پھیرتے ہوئے فرماتے "اے اللہ! سکراتِ موت میں میری مدد فرما"۔ حضرت اُمّ المؤمنین جو بار بار آپؐ کا چہرۂ مبارک دیکھتی جاتی تھیں، فرماتی ہیں کہ "دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ میری آغوش بوجھ سے دبی جا رہی ہے۔ مَیں نے چہرۂ اقدس پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ آنکھیں پتھرائی جا رہی ہیں اور زباں پر یہ الفاظ ہیں" اپنے رب کے پاس جانا چاہتا ہُوں"۔

وُہ بولتا ہُوا قرآن، نُورِ ہدایت کا پیکر، مکمّل نمونۂ حیات، خیر البشرؐ، رحمۃ للعٰلمینؐ، دُشمنوں کا خیر خواہ، مظلوموں کا غم خوار اور انسانیت کا محسنِ اعظم جس کا نصب العین یہ کہ دُنیا میں اللہ ہی کی سلطنت قائم ہو۔ اللہ ہی کے احکامات کی تعمیل ہو، اور اللہ ہی کی عبادت ہو۔ پھر جب اس جدّوجہد کا آغاز کیا تو دنیاوی وسائل مفقود، لیکن ۲۳ سال کے مختصر عرصے میں ایک متحدہ قوم کو ایک مکمّل نظام اور ایک مکمّل آئین عطا فرما کر دوپہر کے قریب ۱۲ ربیع الاوّل، ہجرت کے گیارھویں سال تقریباً تریسٹھ سال کی عمر میں اپنے فرائضِ منصبی کو کامیابی کے ساتھ ادا کر کے اپنے رب کے حضور جا پہنچا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلّم

حیاتِ مقدّس ایک نظر میں

ولادت سے غارِ حرا تک

۲۲ اپریل ۵۷۱ء	پیدائش۔
تقریباً ایک ہفتہ بعد	حلیمہ سعدیہ کی آغوشِ رضاعت میں۔
پانچ سال کی عمر میں	پھر آغوشِ مادر میں۔
چھ سال کی عمر میں	والدۂ ماجدہ کا انتقال۔
آٹھ سال کی عمر میں	دادا (عبدالمطلب) کی وفات۔
بارہ سال کی عمر میں	شام کا پہلا تجارتی سفر۔
۲۵ سال کی عمر میں	حضرت خدیجہؓ سے نکاح۔
۳۰ سال کی عمر کے بعد	قوم کی طرف سے 'الامین' کا خطاب۔
۳۵ سال کی عمر میں	تمام قبائل کی طرف سے حکم (ثالث)۔
	حضرت علیؓ کی کفالت۔
۳۷ سال کی عمر میں	غارِ حرا میں خلوت اور عبادت و تفکر۔

بعثت و نبوّت

	۴۰ سال کی عمر میں	نزولِ وحی۔
۳ سنہ نبوی	۴۳ سال کی عمر میں	چالیس زن و مرد کا اسلام قبول کرنا۔
۵ سنہ ″	۴۵ سال کی عمر میں	حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے صحابہؓ کو حکم۔
۶ سنہ ″	۴۶ سال کی عمر میں	حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا اسلام لانا۔
۷ سنہ ″	۴۷ سال کی عمر میں	کفارِ قریش کی جانب سے بائیکاٹ اور شعبِ ابی طالب میں محصور ہونا۔
۱۰ سنہ ″	۵۰ سال کی عمر میں	معاشرتی مقاطعہ (بائیکاٹ) کا خاتمہ چچا ابو طالب کا انتقال۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات۔ تبلیغِ اسلام کے لیے طائف کا سفر۔ حضرتِ عائشہ سے نکاح۔ معراج کا واقعہ۔
۱۱ سنہ ″	۵۱ سال کی عمر میں	یثرب (مدینے) کے چھ آدمیوں کا قبولِ اسلام
۱۲ سنہ ″	۵۲ سال کی عمر میں	″ ۱۲ ″ ″
۱۳ سنہ ″	۵۳ سال کی عمر میں	یثرب (مدینے) کے ۷۲ آدمیوں کا قبولِ اسلام۔

ہجرت سے رحلت تک:

۵۳ سال کی عمر میں	ہجرتِ مدینہ۔
سنہ ۱ ہجری ۵۴ سال کی عمر میں	مدینے کے شہری نظم و نسق کی دیکھ بھال۔
سنہ ۲ ہجری ۵۵ سال کی عمر میں	کفار کا پہلا حملہ (واقعۂ بدر)۔
سنہ ۳ ہجری ۵۶ سال کی عمر میں	کفار کا دوسرا حملہ (واقعۂ احد)۔
سنہ ۴ ہجری ۵۷ سال کی عمر میں	بنی عامر کی چالبازی اور قاریوں کی شہادت۔
سنہ ۵ ہجری ۵۸ سال کی عمر میں	کفار کا تیسرا حملہ (واقعۂ خندق)
سنہ ۶ ہجری ۵۹ سال کی عمر میں	صلح حدیبیہ۔
سنہ ۷ ہجری ۶۰ سال کی عمر میں	بادشاہوں کو دعوت نامے۔ فتح خیبر
سنہ ۸ ہجری ۶۱ سال کی عمر میں	موتہ کا واقعہ فتح مکّہ اور حنین کا واقعہ
سنہ ۹ ہجری ۶۲ سال کی عمر میں	واقعۂ تبوک مسلمانوں کا حج ادا کرنا۔

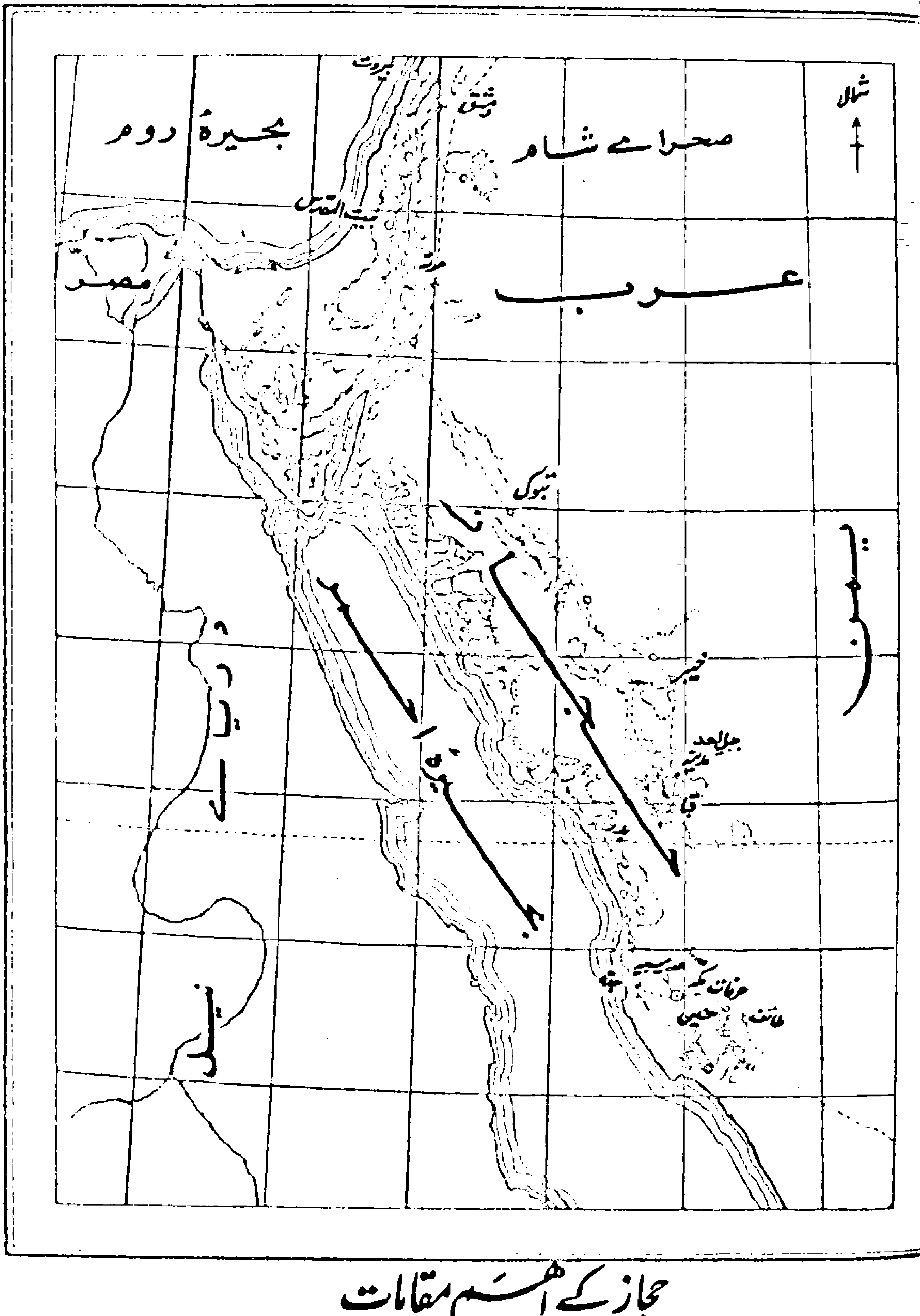
۹ سنہ ہجری ۶۲ سال کی عمر میں	وفود کی آمد۔
۱۰ سنہ ہجری ۶۳ سال کی عمر میں	حج الوداع اور مشہور آخری خطبہ۔
۱۱ سنہ ہجری ۶۳ سال کی عمر میں	علالت و رحلت

اس فہرست کو ترتیب دینے اور کتاب میں شامل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضورؐ کی مبارک زندگی کے خاص خاص واقعات قارئین کی ایک ہی نظر میں ان کے سامنے آجائیں اور پڑھنے والے اس کا اندازہ کر سکیں کہ حضورؐ کی زندگی انتہائی تقدیس اور کامل پاکیزگی کے ساتھ عمل و حرکت اور انقلاب و عزیمت کی زندگی ہے۔

یہ واقعات کب ظہور میں آئے؟ ان کے سنین و تاریخ کے تعین میں مورخین کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ فقیر نے ان تاریخوں کو درج کیا ہے جن کے بارے میں مورخین اور ارباب سیر کی زیادہ سے زیادہ تعداد کا اتفاق ہے۔ سنین و تاریخ کے اختلافات میں ناظرین کو الجھنا نہیں چاہیے کہ اصل چیز واقعے کی اہمیت ہے، اس سے عبرت، ہدایت اور رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

حُلیہ مُبارک

آپؐ کا قد درمیانہ تھا۔ جسم اگرچہ اکہرا تھا، لیکن شانے چوڑے اور سینہ کشادہ تھا۔ استخواں اور اعصاب بہت مضبُوط تھے۔ سر بڑا تھا اور اس کی نشو و نما مستحکم طریق پر ہوئی تھی۔ بال سیاہ تھے اور قدرے گھنگھریالے جو کثیر مقدار میں شانوں تک لٹکتے رہتے تھے۔ سنِ کہولت میں بھی بیس سے زیادہ بال سفید نہیں تھے۔ چہرہ بیضوی اور رنگ گندمی، سرخ و سفید تھا۔ بھویں باریک، لمبی اور خمیدہ تھیں اور اُن کے درمیان ایک رگ تھی جو جوش کے وقت تیزی سے حرکت کرتی نظر آتی تھی۔ پلک لمبے اور گھنے تھے اور ان میں سے نہایت سیاہ پُتلی والی بڑی بڑی مشاہدہ کن آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ناک بڑی اور آگے سے ذرا جُھکی ہوئی تھی۔ دانت نہایت سفید اور چمکیلے تھے۔ داڑھی گردے دار تھی جو آپؐ کے مردانہ چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جلد شفّاف و ملائم اور ہاتھ ریشم کی طرح چکنے اور نرم تھے۔ جب آپؐ چلتے تو ہر قدم جما کر رکھتے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ بلندی سے نشیب کی طرف آ رہے ہیں۔ آپؐ بجائے مُنّہ پھیرنے کے پُورا جسم گُھماتے تھے۔ آپؐ کی رفتار اور وضع قطع سے تمکنت و وقار نمایاں ہوتا اور چہرے سے شفقت و سنجیدگی ٹپکتی۔ آپؐ کی ہنسی تبسّم کی حد سے نہ بڑھتی تھی۔



حجاز کے اہم مقامات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت
کے محسنِ اعظمؐ ہیں۔ اس باب میں دو
رائیں ہو ہی نہیں سکتیں اور آپؐ کے صحابہؓ
خاص طور سے خلفائے راشدینؓ جو آپؐ
کے رفیق تھے، انسانیت کے "محسنینؓ"
ہیں۔ اس لیے محسنِ اعظمؐ کے مقدس
تذکرے کے بعد ان "محسنینؓ" کا مبارک
ذکر اس صحیفۂ سعادت کا تتمہ ہے

حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

"ابوبکر" آپؓ کا نام نہیں لقب تھا۔ "بکر" عربی زبان میں اونٹ (شتر جوان) کو کہتے ہیں۔ آپؓ کو اونٹوں کی دیکھ بھال، پرورش، نسل کشی اور غور و پرداخت سے خاص دلچسپی تھی؛ اونٹوں کے علاج معالجے میں بھی دسترس رکھتے تھے؛ اس لیے قریش میں آپؓ کا لقب "ابوبکر" مشہور ہوگیا اور اسی لقب سے پکارے جانے لگے۔ آپ کے والدین کی اولاد جیتی نہیں تھی، اس لیے انھوں نے کعبے میں منّت مانی کہ ان کا بچّہ پیدا ہوکر زندہ رہا تو اس کا نام عبدالکعبہ (کعبے کا بندہ) رکھیں گے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کے اب جو بچہ پیدا ہوا وہ زندہ بھی رہا۔ لہٰذا اس کا نام عبدالکعبہ رکھا گیا۔ یہی بچّہ تھا جو آگے چل کر عبدالکعبہ سے عبداللہ اور پھر صدّیقِ اکبرؓ ہوا۔ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے آپؓ کا نام عبدالکعبہ سے بدل کر عبداللہ رکھ دیا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا بندگی کی نسبت کسی مقام، شخصیت اور چیز سے نہیں رکھتا۔ ابوبکر جوان ہوئے تو "عتیق" بھی کہلانے لگے۔ "عتیق" کے معنی ہیں آزاد شدہ غلام، اس لیے کہ اپنے والدین کے عقیدے کے مطابق آپؓ نے موت سے نجات حاصل کی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کو اللہ نے بہت کچھ دے رکھا تھا۔ وہ ایک متمول تاجر تھے اور مکے میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہی ابوبکرؓ کو حضورؐ کی دوستی اور رفاقت کی سعادت حاصل تھی۔ حضورؐ نے بعثت کے بعد جب اسلام کی دعوت دی تو سب سے پہلے کون اسلام لایا؟ اس میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ملتا ہے مگر یہ اختلاف اس طرح دور ہوسکتا ہے کہ بالغ آزاد مردوں میں حضرت ابوبکرؓ، کم سنوں میں حضرت علیؓ، غلاموں میں حضرت زیدؓ اور عورتوں میں حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے ایمان لائیں۔

حضرت ابوبکرؓ مسلمان ہونے کے بعد اسلام کے پُرجوش مبلغ بن گئے۔ دن رات اسی کی فکر اور جدوجہد کہ ایمان و اسلام کی جو روشنی انھیں نصیب ہوئی ہے۔ اس سے دوسرے بھی بہرہ ور ہوں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ انھیں کی کوشش سے اسلام لائے۔ حضرت بلالؓ جو مؤذن اور عاشقِ رسولؐ کے لقب سے مشہور ہیں، ان کو بھی حضرت ابوبکرؓ ہی نے اُن کے بے رحم اور سفاک آقا سے خرید کر آزاد کیا۔ کتنے ہی دوسرے غلاموں کو بھی ابوبکرؓ نے اسی طرح آزاد کرایا، ان میں حضرت عمرؓ کی کنیز بھی شامل تھی۔

اسلام کا اعلان کرتے ہی پورا مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہوگیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس پُرآشوب زمانے میں حضورؐ کی نہ صرف دل و جان سے رفاقت کی بلکہ انھوں نے خود بھی اللہ کے دین کی خاطر طرح طرح کی سختیاں جھیلیں۔

مکے میں جب حضورؐ کو معراج ہوئی اور آپؐ نے اس واقعے کا ذکر فرمایا تو کافروں نے ابوبکرؓ سے جاکر کہا کہ "تمھارا نبیؐ اب تو عجیب و غریب باتیں کرنے لگا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں راتوں رات آسمانوں کی سیر کر کے مکے میں واپس آگیا" ابوبکرؓ

نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "کیا تم سے یہ باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں؟" انھوں نے کہا "ہاں ہاں، انھوں نے کہی ہیں"۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ بے اختیار بول اٹھے "اگر حضورؐ نے ایسا فرمایا ہے تو سچ فرمایا ہے۔ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں"۔ اس دن سے آپؓ کا لقب "صدیق" مشہور ہو گیا۔

کفارِ مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر بہت سے صحابہؓ مکے سے ہجرت کر چکے تھے حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ سے ہجرت کی اجازت چاہی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا "ابوبکر! جلدی نہ کرو۔ شاید اس سفر کے لیے کوئی بہتر ساتھی مل جائے"۔

مکے کی سرزمین کو دین کی فصل کے لیے بنجر پا کر اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت کا قصد فرمایا تو ابوبکرؓ کے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ہجرت کی تیاری کرو۔ اللہ تعالیٰ نے سفرِ ہجرت کے اہتمام اور تیاری کی سعادت حضرت ابوبکرؓ صدیق کے گھرانے کے لیے مقدر فرما دی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کئی مہینے پہلے سے دو اونٹنیوں کو "ببول" کی سبز و ملائم پتیاں کھلا کھلا کر فربہ اور تیار کر رکھا تھا وہ اس مقدس سفر میں کام آئیں۔ حضرت ابوبکرؓ تین دن تک غارِ ثور میں حضورؐ کے ساتھ مقیم رہے۔ آپؓ کے آزاد کردہ غلام عامرؓ رات کے اندھیرے میں بکریاں لے کر غارِ ثور آتے۔ اس طرح تین دن بکریوں کے دودھ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کے رفیق، یارِ غار ابوبکرؓ نے گزارا کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ساری پونجی اس سفر میں ساتھ لے لی تھی کہ نہ جانے راستے میں حضورؐ کو کیا ضرورت پیش آ جائے۔ یہ سفر بڑے خطرے اور جان جوکھوں کا سفر تھا۔ آپؓ کے والد نابینا

تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کے بیٹے ابو بکرؓ ہجرت کر گئے تو انھوں نے پوتیوں سے کہا کہ ابُو بکرؓ سارا مال و متاع ساتھ لے گیا ہوگا۔ ہمارے لیے کچھ نہ چھوڑا ہوگا۔ اس پر حضرت ابُو بکرؓ کی صاحبزادی اسماءؓ نے اپنے دادا کو اس جگہ لے جا کر کھڑا کر دیا جہاں حضرت ابو بکرؓ اپنا مال رکھتے تھے اور چند پتھر درہم و دینار کی جگہ رکھ دیے اور پھر اپنے دادا سے کہا کہ آپ خود چھو کر دیکھ لیں۔ وہ ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ اللہ اللہ! کیا عشقِ رسُولؐ اور دینی اخلاص تھا کہ اولاد کی نگہبانی اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دی اور ساری پُونجی حضوُرؐ کی خدمت کے لیے سفر میں ساتھ رکھی۔

رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مقدّس زمانے میں کافروں سے جو لڑائیاں ہوئیں اُن سب میں حضرت ابو بکرؓ نے شرکت کی اور حضوُرؐ کی اطاعت، رفاقت اور محبّت کا ثبوت دیا۔ غزوۂ بدر میں تو ایسا ہوا کہ مسلمانوں کی فوج میں حضرت ابو بکرؓ شامل تھے اور کفّار کی طرف سے آپؓ کا بیٹا جو اب تک مسلمان نہ ہوا تھا لڑ رہا تھا۔ اس واقعے کے بعد جب وہ نوجوان مسلمان ہو گیا تو اس نے کہا کہ "اباجان! جنگِ بدر میں آپ دو تین بار میری تلوار کی زد میں آ گئے تھے، لیکن مَیں نے تلوار روک لی کہ آپ میرے باپ ہیں"۔ اس پر حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "خدا کی قسم! تو اگر میری تلوار کی زد میں ایک دفعہ بھی آجاتا تو تجھے قتل کرنے سے گریز نہ کرتا"۔ یہ تھا ایمان اور اسلام کا وُہ گہرا نقش اور رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فیضانِ صحبت کہ ہر دشمنِ خدا کو اپنا ذاتی دشمن سمجھتے، خواہ وہ ان کی اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام کے رشتے کے آگے اور تمام رشتے ہیچ ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپؓ کی چہیتی بیٹی ازواجِ مطہرات میں سے تھیں۔ اُن کا نکاح کم سنی ہی میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہوگیا تھا۔ یہ مکے کا واقعہ ہے۔ ہجرت کے بعد مدینے میں رُخصتی ہوئی۔ حضرت عائشہؓ کو حضورؐ بہت محبوب رکھتے تھے۔ خشیتِ الٰہی، محبتِ رسولؐ اور عبادت وعفت کے علاوہ علم وفضل کے اعتبار سے بھی آپؓ کا پایہ بہت بلند تھا۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بیماری کے زمانے میں حضورؐ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابوبکرؓ نے نماز کی امامت فرمائی۔ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا وصال ہوا تو ابوبکرؓ نے وہاں پہنچ کر چہرۂ اقدس سے چادر ہٹائی۔ رُخسارِ مبارک کو بوسہ دیا اور کہا:

"کیا ہی بابرکت تھی آپؐ کی زندگی اور کتنی پاکیزہ ہے آپؐ کی موت!"

حضورؐ کی وفات سے مسلمانوں میں جو افسردگی اور سراسیمگی پھیلی اُس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ایک اتنی ہمہ گیر ہستی، ایک مرکزی نشان، ایک ہادی، ایک خدا کا پیغام پہنچانے والا یعنی ایک مکمل سایے سے محروم ہوجانا کوئی معمولی سانحہ نہ تھا۔ اس خلا کو پورا کرنے کے لیے صرف وہی آدمی اپنے آپ کو پیش کرسکتا تھا، جس نے اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین حضورؐ کے عشق اور احکاماتِ الٰہی کے لیے وقف کیا ہو۔

حضرت عمر فاروقؓ کتنے جلیل القدر، صاحبِ تحمل اور حوصلہ مند انسان تھے۔

ان پر یہ کیفیت گزری کہ تلوار نیام سے کھینچ لی اور اعلان کیا کہ جو کوئی یہ کہے گا کہ محمدؐ کو موت آگئی ہے، اس کا سر تلوار سے قلم کر دوں گا۔ بڑے سخت امتحان کا وقت تھا۔ اس سراسیمگی اور شدّتِ جذب واثر کے بڑے خطرناک اور دُوررس نتائج ظہور میں آ سکتے تھے۔ اس نازک موقع پر حضرت ابوبکرؓ کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی۔ وہ حالات کی نزاکت کا اندازہ لگانے کے بعد مسجد نبوی کے منبر پر چڑھ گئے اور فرمایا :

"اے لوگو! جو شخص محمدؐ کو پوجتا تھا اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمدؐ تو فوت ہو گئے، لیکن جو شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ یقیناً زندہ ہے۔ اس پر کبھی موت وارد نہ ہوگی"۔

اس کے بعد قرآن کی یہ آیت تلاوت کی :

(مفہوم) "محمدؐ اللہ کے رسُول ہیں اور ان سے پہلے بھی رسُول گزر چکے ہیں۔ اگر محمدؐ وفات پا جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل (کفر کی جانب) پھر جاؤ گے اور جو شخص ایڑیوں کے بل پھر جائے، وہ اللہ کو ذرا سا بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا اور عنقریب اللہ شکر گزار بندوں کو نیک بدلا دے گا"۔

اس تقریر کے بعد ماحول میں سکون پیدا ہُوا۔ حضرت عمرؓ نے تو یہ محسوس کیا کہ جیسے قرآن کی یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے اور اس کا مفہوم ان کی سمجھ میں اب آیا ہے۔

ملّت امیر کے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔ پھر یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں منافقین

کو فساد و انتشار برپا کرنے کا موقع نہ مل جائے۔ اس سے پیشتر کہ صورتِ حال میں کوئی تلخی اور خرابی پیدا ہوتی اور کشاکش کی نوبت آتی۔ حضرت عمرؓ نے چند اکابر صحابہؓ سے مشورے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ خلافتِ رسولؐ کی ذمے داری اور ملّت کی امارت کا بارِ عظیم۔ یہ ابوبکرؓ ہی کی ایمانی جرأت تھی کہ اس بارِ گراں کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ خلافت کا اعلان ہوتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور خطبہ دیا۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا:۔

"لوگو! میں تمھارا حاکم بنایا گیا ہوں۔ لیکن میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں نیک کام کروں تو اُس میں میری مدد کرو اور برا کام کروں تو مجھے ٹوکو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ تمھارا کمزور شخص میرے نزدیک قوی ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلا دُوں اور تمھارا قوی میرے نزدیک کمزور ہے جب تک اُس کے ذمے جو حق ہے وہ اُس سے نہ لے لوں۔ جو قوم اللہ کے راستے میں جہاد ترک کر دیتی ہے، اس پر اللہ ذلت و خواری مسلط کر دیتا ہے اور اگر کسی قوم میں بے حیائی پھیل جاتی ہے تو اللہ اس پر بلائیں اور عذاب عام کر دیتا ہے۔ تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کروں لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی

کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔“

یہ دبستانِ نبوت کی تعلیم و تربیت اور حضورؐ کے فیضانِ صحبت کا اثر تھا کہ اس مختصر سے خطبے میں حضرت ابوبکرؓ نے وہ جامع اصول بیان فرما دیے ہیں جو حکمرانی اور جہاں بانی کی اساس ہیں اور چودہ سو سال کے بعد بھی ان اصول کی تازگی میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ کا یہ خطبہ درحقیقت حکمرانی کا ”مقدس منشور“ اور ہر دور کی حکومتوں کے لیے ”صحیفۂ ہدایت“ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر قبائل عرب میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور وہ لوگ جو اسلام سے دلوں میں بغض اور کدر رکھتے تھے، ان کا نفاق پوری طرح اُبھر آیا۔ ایک طرف منافقوں کی دراندازیاں اور دوسری طرف بعض قبیلوں کا اسلام ترک کر کے ارتداد کی راہ اختیار کرنا۔ اسلام کے دشمن لوگوں میں اس قسم کی افواہیں پھیلا رہے تھے کہ اسلام محمدؐ ابن عبداللہ کے دم سے قائم تھا۔ وہی دنیا میں نہ رہے تو بےچارہ اسلام کیا رہے گا۔ یہودیوں اور نصرانیوں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس فتنے کو خوب ہوا دی۔ بڑا نازک وقت تھا۔ ایسا محسوس کیا جا رہا تھا، جیسے خدانخواستہ اسلام کا شیرازہ بکھرا جا رہا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان نازک حالات میں جس ایمانی استقامت اور عارفانہ فراست و حکمت کا ثبوت دیا ہے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور خطبہ ارشاد فرمایا:۔ (دیگر عمّال نے بھی حالات کے پیشِ نظر اسی مضمون کے خطبے دیے۔)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے اسلام کی قوت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس بارے میں جو شخص شک و شبہ میں مبتلا ہوگا، تذبذب کی راہ اختیار کرے گا اور ارتداد کے متعلق سوچے گا، ہم اس کی گردن اڑا دیں گے۔ یقیناً اسلام بدستور قائم رہے گا۔ اُسے کوئی ضعف نہیں پہنچے گا اور رسُول اللہ کے حسبِ ارشاد خلافت بھی تمہارے ہی حصے میں آئے گی۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس عزم و استقامت، صدق و اخلاص اور ایمانی جرأت کے سبب جو لوگ اسلام سے قطعِ تعلق اور راہِ انحراف اختیار کرنے کی سوچ رہے تھے، وہ رک گئے اور مرتدین کی تعداد میں مزید اضافہ نہ ہو سکا۔ ارتداد کے ساتھ ساتھ ایک فتنہ "زکوٰۃ نہ دینے" کا اُٹھ کھڑا ہوا۔ ان حیلہ جُویوں نے اس نکتے کا سہارا لیا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو زکوٰۃ ادا کی جا سکتی تھی کہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی اور نبی ہونے کی حیثیت سے آپؐ زکوٰۃ وصول فرماتے تھے، مگر آپؐ کی وفات کے بعد اب کسی کو زکوٰۃ لینے کا حق نہیں پہنچتا۔ ارتداد اور منعِ زکوٰۃ یہ دو فتنے ہی ملت کے نظام کو منتشر اور پارہ پارہ کرنے کے لیے کیا کم تھے کہ تیسرا فتنہ نبوت کے جھوٹے مدعیوں نے کھڑا کر دیا۔ وہ قبیلے جنھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تھا، اُن کا رجحان ان جھوٹے نبیوں کی طرف تھا۔ ان فتنوں نے پورے عرب کو ہلا دیا مگر حضرت ابوبکرؓ کے پائے استقامت میں جنبش نہ آئی، بلکہ ان کے قدم پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ سختی کے ساتھ جم گئے۔ خدا پرستوں اور حق شناسوں

کی خاصیت ہے کہ مشکلوں مصیبتوں اور آزمائشوں میں ان کا عزم اور زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے شام کی طرف ایک لشکر روانہ فرمایا تھا جس کے سپہ سالار حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ تھے۔ اس لشکر نے مدینے سے چل کر تھوڑی دُور کے فاصلے پر مقامِ جرف میں قیام کیا اور حضورؐ کی علالت کے سبب آگے نہ بڑھ سکا۔ یہاں تک کہ حضورؐ وفات پا گئے۔

حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جیشِ اُسامہؓ کا مسئلہ آیا۔ صحابہؓ نے رائے دی کہ ملک میں ارتداد و بغاوت کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اس عالم میں فوج کا باہر بھیجنا مناسب نہیں۔ پہلے گھر کے فتنوں سے نبٹ لینا ضروری ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا:۔

> "مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر مدینے میں کوئی ایک شخص بھی باقی نہ رہے اور میں اکیلا رہ جاؤں اور جنگل کے درندے مجھے اٹھا کر لے جائیں تو بھی میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کے مطابق اُسامہؓ کو اِس مُہم پر ضرور بھیجوں گا۔"

یہ ہے وہ عشقِ رسُولؐ کا جذبہ اور اطاعتِ رسُولؐ کا جوش، جس نے ابوبکرؓ کو "صدیق" بنا دیا۔

حضرت اُسامہؓ جب گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ اُن

کے ساتھ پا پیادہ چل رہے تھے۔ حضرت اُسامہؓ نے کہا :

"یا تو آپ بھی گھوڑے پر سوار ہو جائیے یا مجھے اُترنے کی اجازت دیجیے ورنہ میں سواری سے اُترا جاتا ہوں!"

حضرت ابو بکرؓ نے اس پر فرمایا :

"خدا کی قسم! نہ میں سوار ہوں گا، نہ تمھیں سواری سے اُترنے دوں گا۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں میرے پیروں کو بھی تو غبار آلود ہونے دو۔"

پھر آپؓ نے لشکر کو نصیحت فرمائی :۔

"اے لوگو! ٹھیر جاؤ۔ میں تمھیں دس نصیحتیں کرتا ہوں، اُنھیں یاد رکھو۔ (دیکھو!) خیانت نہ کرنا۔ بدعہدی نہ کرنا۔ (مقتولوں کے) اعضاء نہ کاٹنا۔ چھوٹے بچے، بوڑھے اور عورت کو قتل نہ کرنا۔ کھجور کے درخت کو نہ جلانا۔ پھل دار درخت نہ کاٹنا۔ بکری، گائے اور اونٹ کو کھانے کے علاوہ ذبح نہ کرنا۔ تم ایسے لوگوں کے پاس سے گزرو گے، جنھوں نے گرجاؤں میں اپنے آپ کو عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے، تم انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ تمھارا ایسے لوگوں سے بھی سابقہ پڑے گا جو تمھارے لیے برتنوں میں طرح طرح کے کھانے لائیں گے۔ جب بھی کھانا شروع کرنا۔ اس پر اللہ کا نام ضرور لے لینا۔ تم ایسے لوگوں سے بھی ملو گے، جنھوں نے سر

کے بیچ کا حصّہ تو منڈوا دیا ہوگا، لیکن سر کے ارد گرد بالوں کی لٹیں لٹکتی ہوں گی۔ تم ان کو تلوار سے کھٹکھٹانا۔ جاؤ، اللہ کا نام لے کر سدھارو۔ اللہ تعالیٰ دشمن کے نیزوں اور طاعون سے محفوظ رکھے۔"

یہ ہیں جنگ کے وہ زرّیں اصول جو دنیا کے لیے ہر دور میں معیار اور نمونہ بن کر رہیں گے اور جن کو انسانیت کے لیے رحمت سمجھا جائے گا۔ اوپر کہا جا چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس بارے میں بیشتر صحابہؓ کی رائے یہ تھی کہ مانعینِ زکوٰۃ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ نئے نئے ایمان لائے ہیں۔ جب ایمان پختہ ہو جائے گا تو یہ اپنی خوشی سے خود بخود زکوٰۃ دینے لگیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس مشورے کو قبول نہ کیا۔ آپؓ نے فرمایا:

"خدا کی قسم! اگر یہ لوگ ایک رسّی دینے سے بھی انکار کریں گے، جیسے وہ رسولؐ اللہ کے زمانے میں دیا کرتے تھے تو میں ان سے جنگ کروں گا اور زکوٰۃ کیا ہے! مال کا حق (یعنی عبادت) ہے جو لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کریں گے، مَیں ان سے قتال کروں گا۔"

حضرت عُمر رضی اللہ عنہ حق کے معاملے میں کس قدر شدید اور حسّاس تھے، مگر وہ بھی ابوبکرؓ سے کہنے لگے کہ ہم ان لوگوں سے کس طرح جنگ کر سکتے ہیں جبکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

"مجھے اس وقت تک لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے، جب
تک وہ زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللّٰہِ
نہ کہیں۔ جو شخص یہ کلمہ زبان سے ادا کر دے گا، اس کی جان و
مال کی حفاظت مسلمانوں کے ذمّے ہو گی۔"

حضرت ابو بکرؓ کو عمر فاروقؓ کی رائے متاثر نہ کر سکی۔ آپؓ کی دلیل یہ تھی کہ جہاں تک فرضیت کا تعلق ہے نماز اور زکوٰۃ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآنِ پاک میں جگہ جگہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا ذکر اور حکم ساتھ ساتھ آیا ہے۔ قرآن حکم دیتا ہے :۔

(مفہوم) "پس اگر یہ لوگ توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا
کر دیں تو تم ان سے کچھ نہ کہو۔"

علم و آگہی اور ایمان و اسلام اس کی شہادت دیتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کا فیصلہ کس قدر صحیح تھا اور آپؓ کی رائے کس درجہ صائب تھی۔ حضرت عمرؓ تک نے اپنی رائے بدل دی۔ انھوں نے تو یہاں تک اعتراف کیا کہ "مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ابو بکرؓ کا سینہ کھول دیا ہے" حقیقت بھی یہ ہے کہ "شرحِ صدر" صدیقِ اکبرؓ کا نہ ہوتا تو اور کس کا ہوتا۔ جن قبیلوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تھا، انھوں نے اپنے جاسوس مدینے میں لگا رکھے تھے۔ جاسوسوں نے قبائل میں جا کر اطلاع پہنچائی کہ اسامہؓ کے ساتھ صحابہؓ کی کافی تعداد مدینے سے باہر جا چکی ہے۔ تھوڑے سے صحابہؓ رہ گئے ہیں۔ مدینے پر چڑھائی کرنے کا یہ بڑا ہی موزوں موقع ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے بھی نزاکتِ حالات کو بروقت محسوس کیا چنانچہ آپؓ نے ان راستوں پر جو مدینے کو آتے تھے، چند اکابر صحابہؓ کی سرکردگی میں حفاظتی دستے متعین فرمادیے۔ ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ یہ قبائل مدینے پر شب خون مارنے کے لیے مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے کمال بسالت وجرأت کے ساتھ مسلمانوں کو ساتھ لیا اور خود اونٹ پر سوار ہوکر قبائل کی ان ٹولیوں پر حملہ کردیا۔ یہ لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے مگر اچانک حملے نے اس قدر بدحواس اور سراسیمہ کیا کہ بھاگ جانے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار ہی انھیں نظر نہ آیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ کے علاوہ مدعیانِ نبوّت سے بھی جہاد وقتال کیا اور اس طرح آپؓ نے اسلامی حکومت کے ایک ایک فتنے کا قلع قمع کرکے چھوڑا۔ عراق کی فتح کا آغاز آپؓ کے دورِ خلافت میں ہوچکا تھا۔ ایرانیوں اور رومیوں کے حملوں کا بھی سدّباب آپؓ نے کیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ حکومت کے داخلی اور خارجی معاملات سے کس قدر باخبر تھے اور ان مسائل میں آپؓ کو کتنی گہری بصیرت حاصل تھی۔

خلافتِ ابوبکرؓ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بڑی ایمانی جرأت اور ساتھ ہی فنونِ جنگ میں غیر معمولی قابلیت ومہارت کا ثبوت دیا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ایک قبیلے کا سردار حضرت خالدؓ کے خلاف شکایت لے کر مدینے پہنچا۔ اُس نے سب سے پہلے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ حضرت عمرؓ اسے ساتھ لے کر دربارِ خلافت میں پہنچے اور حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ آپ خالدؓ کو معزول کردیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے جواب میں فرمایا:۔

"اے عمر! ایسا نہیں ہو سکتا۔ مَیں اس تلوار کو بھلا کس طرح نیام
میں ڈال دُوں جسے اللہ تعالیٰ نے کافروں پر مسلّط کیا ہے"۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ دُشمن کے سرداروں کو کوئی پیغام بھجواتے تو فرماتے :۔

"ان سے کہہ دینا میں تمہارے پاس ایک ایسی قوم کو لا رہا ہُوں
جو موت کی اتنی ہی شیدائی ہے جتنے تم زندگی کے ہو"۔

حضرت ابو بکرؓ کو رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس سے بے پناہ محبت تھی بلکہ والہانہ عشق تھا۔ اسی نسبت اور تعلّق کی بنا پر اہلِ بیتؓ کرام سے بھی آپؓ کو بڑی محبت تھی۔ حضورؐ کے وصال کو چند دن ہُوئے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکل رہے تھے کہ اتنے میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ محلّے کے بچّوں کے ساتھ کھیلتے نظر آ گئے۔ ابو بکرؓ نے حسنؓ کو فرطِ محبت و احترام سے اپنے کاندھے پر اُٹھا لیا۔

عراق پر جب فوج کشی ہو رہی تھی تو مالِ غنیمت میں ایک عبا بھی تھی، جو حضرت خالدؓ نے خلیفہ کو بطور تحفہ بھیجی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ عبا حضرت حسینؓ ابنِ علیؓ کو نذر کر دی۔

کافروں سے جو جنگیں ہوئیں، ان میں بہت سے حفاظِ قرآن شہید ہو گئے۔ اس پر حضرت عمر فارُوقؓ کے مشورے سے حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کو کتابی صورت میں جمع اور مدوّن کیا۔ یہ اتنی بڑی سعادت صدّیقِ اکبرؓ کے حصّے میں آئی، جس کے اَجر و ثواب

کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت علیؓ نے بجا ارشاد فرمایا :۔

"قرآنِ کریم جمع کرنے کی وجہ سے وہ (ابو بکرؓ) تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اجر کے مستحق ہیں"

ہجرت کے وقت جب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مبارک سواری مدینے پہنچی ہے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنی چادر کا سایہ حضورؐ کے سرِ اقدس پر کیے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خوشنودی ابو بکرؓ صدیق کو ہمیشہ حاصل رہی۔ حضورؐ نے فرمایا :

"اگر میں (اللہ کے بعد) کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکرؓ کو بناتا"

حضرت ابو بکرؓ طبیعت کے بے حد نرم تھے مگر دین کے معاملے میں نرمی نہیں برتتے تھے۔ قرآن شریف سے آپؓ کو بے حد شغف تھا۔ جب قرآن کی تلاوت کرتے تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ جاہلیت کے زمانے میں بھی ابو بکرؓ صدیق خوش خُلق، لوگوں کے غم خوار اور پاکباز تھے۔ کبھی شراب نہیں پی، جُوا نہیں کھیلا اور کسی بُت کے آگے سر نہیں جھکایا۔ اسلام لانے کے بعد یہ سونا کندن بن گیا۔

ابو بکرؓ غریبوں کے دُکھ درد میں ان کے کام آتے۔ روپے پیسے سے اُن کی مدد کرتے۔ طبیعت میں انکسار کا یہ عالم تھا کہ اپنی بکریاں جنگل میں خود چرانے اور محلے والوں کی بکریوں کا دُودھ ان کے لیے دوہتے۔ رات کی تنہائی میں نمازیں پڑھتے۔ دن کو روزے رکھتے۔ اس خشیت و تقوٰی کے باوجود اپنے بیوی بچوں سے محبت کرتے۔ دین و دنیا کے خوش گوار امتزاج کی ایسی مثال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد

اور کہاں ملے گی ؟

حضرت ابوبکرؓ صدیق مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو صحابہؓ کرام سے مشورہ فرمایا اور باہمی مشاورت کے بعد حضرت عمر فاروقؓ رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اپنی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں اپنی بیٹی عائشہؓ کو وصیت کی کہ مجھے پرانے کپڑوں میں کفنانا نئے کپڑے پہننے کے مستحق زندہ لوگ ہیں۔ آپؓ کی زبان سے جو آخری کلمات سنے گئے وہ یہ ہیں :-

"اے میرے پروردگار! مجھے مسلمان ہونے کی حالت میں وفات
دینا اور مرنے کے بعد صالحین کے پاس جگہ عطا فرمانا۔"

وفات کے وقت حضرت ابوبکرؓ کی عمر تریسٹھ سال کی تھی۔ اسی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا تھا۔ دوشنبے کے دن ۲۱ جمادی الاخری ۱۳ سنہ ہجر (مطابق ۲۲ اگست ۶۳۴ء) کو صرف ۲۷ ماہ کی خلافت کے بعد خلیفۂ اوّل نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک پہلو میں آپؓ کو اس ہیئت سے دفن کیا گیا کہ آپؓ کا سر حضورؐ کے کاندھوں کے متوازی رکھا اس طرح جو "رفیقِ غار" تھا وہ "رفیقِ قبر" بھی بن گیا۔

حضرت ابوبکرؓ خلافت کے زمانے میں بہت ہی کم تنخواہ لیتے تھے۔ ان کی زندگی انتہائی سادہ اور تکلفات سے پاک تھی۔ سادہ غذا کھاتے اور سادہ لباس پہنتے وفات سے قبل اپنے رشتے داروں کو وصیت کی کہ جو وظیفہ میں نے بیت المال سے لیا ہے۔ میری فلاں زمین بیچ کر اسے ادا کر دیا جائے۔ ان کی وفات کے بعد جب یہ رقم

حضرت عمر فاروقؓ کے پاس پہنچی تو وہ بے ساختہ رو پڑے اور فرمایا:

"ابوبکرؓ! تم پیچھے جانشینوں کے لیے بہت دشوار کام چھوڑ گئے"

حضرت ابوبکرؓ کی وفات پر حضرت علیؓ نے آپ پر رو رو کر فرمایا:

"اے ابوبکرؓ! اللہ تم پر رحم کرے! واللہ! تم پہلے آدمی تھے جس نے رسول اللہ کی آواز پر لبیک کہی اور اسلام قبول کیا۔ ایمان و اخلاص میں تمھارا جواب کوئی نہ تھا۔ خلوص و محبت میں تم سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ صداقت، قربانی اور بزرگی میں تمھارے جیسا کوئی دوسرا نہ تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت تم نے کی اور رسول اللہ کی رفاقت میں جس طرح ثابت قدم رہے اس کا بدلہ اللہ ہی تمھیں دے گا۔"

"واللہ! تم اسلام کے مضبوط قلعے تھے۔ کافروں کے لیے تمھارا وجود انتہائی تکلیف دہ تھا۔ تمھاری کوئی دلیل وزن سے خالی نہ ہوتی تھی اور تمھاری بصیرت اور فہم و فراست درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ تمھاری سرشت میں کمزوری کا ذرا سا بھی دخل نہ تھا۔ تم ایک پہاڑ کے مانند تھے، جسے تند و تیز آندھیاں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتیں۔ اگرچہ تم جسمانی لحاظ سے کمزور تھے، مگر دینی اعتبار سے جو قوت تمھیں حاصل تھی اس کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔ تم اپنے کو بندۂ پُرتقصیر سمجھتے تھے، لیکن اللہ کے نزدیک تمھارا مرتبہ بے حد بلند تھا۔ تم دنیا والوں کی نگاہ میں واقعی

ایک جلیل القدر انسان تھے اور مسلمانوں کی نگاہ میں انتہائی بلند و بالا شخصیت کے مالک۔ لالچ اور نفسانی خواہشات تمہارے پاس بھی نہ پھٹکتی تھیں.... اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہمیں تمہارے اجر سے محرُوم نہ رکھے اور ہمیں تمہارے بعد بے یار و مددگار نہ چھوڑ دے بلکہ ہمارے سہارے کے لیے کوئی نہ کوئی سامان پیدا فرما دے۔"

یہ تھا صحابہؓ کرام کے باہمی اخلاص و محبت اور یگانگت کا وہ نمونہ جو حضورؐ کے فیض صحبت اور حسنِ تربیت سے اُن میں کار فرما تھا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمرؓ ہجرت نبوی سے چالیس سال پہلے قریش کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جد امجد عدی قریش کے سرکردہ لوگوں میں سے تھے۔ قریش نے سفارت کا عہدہ ان کے قبیلے کے سپرد کر رکھا تھا۔ عدی ہی کی وجہ سے سفارت کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ کے والد خطاب قریش میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ نویں پشت میں جا کر آپؓ کا سلسلہ نسب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ اہل عرب کو نسب دانی کے معاملے میں یہاں تک دلچسپی تھی کہ وہ انسانوں ہی کے نہیں بلکہ گھوڑوں اور کھجوروں تک کے نسب نامے یاد رکھتے۔ حضرت عمرؓ کا خاندان نسب دانی میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ آپؓ نے بڑے ہو کر نسب دانی کے علاوہ سپہ گری، پہلوانی اور خطابت بھی سیکھی۔ جبل عرفات کے قریب عکاظ میں ہر سال جو میلہ لگتا تھا اُس کے دنگلوں میں حضرت عمرؓ نے کشتیاں لڑی ہیں اور پہلوانی کے جوہر دکھائے ہیں۔ آپؓ نے اسی زمانے نوشت و خواند بھی سیکھ لی تھی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنی بعثت کا اعلان فرمایا تو اس وقت قریش کے زیادہ سے زیادہ سترہ آدمی لکھنا جانتے تھے۔ ان میں حضرت عمرؓ بن خطاب بھی شامل تھے۔

حضرت عمرؓ نے معاش کے لیے تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور تجارت کی غرض سے دُور دراز کے مُلکوں کا سفر کیا اور وہاں کے بادشاہوں سے بھی ملے۔ عمر جو ابھی تک "حضرت عمرؓ" نہیں ہوئے تھے یعنی اسلام لانے سے پہلے بھی بڑے خُود دار، غیرت مند اور باحوصلہ شخص تھے۔ لین دین میں بات کے کھرے اور پکے تھے۔

مکے میں جب توحید کی صدا بلند ہُوئی تو حضرت عمرؓ ستائیس برس کے تھے۔ یہ صدا آپؓ کے لیے اجنبی اور نامانوس تھی۔ اس لیے آپؓ کو جس کسی کے بارے میں پتہ چل جاتا کہ وہ مسلمان ہوگیا ہے تو اس کے دشمن اور درپے آزار ہو جاتے۔ ایک کنیز کو جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس قدر زدوکوب کیا کہ وہ بے چاری نڈھال ہو گئی۔ عمر اسے مارتے مارتے بیٹھ گئے اور بولے "مَیں تھک گیا ہوں، اس لیے تجھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تیری حالت پر رحم آگیا ہے"۔

قریش کے سربرآوردہ اشخاص اسلام اور حضورؐ کی مخالفت میں سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ عمرؓ بن خطاب ایک دن ننگی تلوار لے کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لیے گھر سے چل پڑے۔ راستے میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ عمرؓ کے سخت تیور اور ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر اس نے پوچھا "عمرؓ! خیر تو ہے۔ کہاں کا ارادہ ہے"۔ عمرؓ بولے "محمدؐ کا کام تمام کرنے کا"۔ اس شخص نے کہا "اپنے گھر والوں کی تو خبر لو۔ تمھاری بہن اور تمھارے بہنوئی اسلام قبول کر چکے ہیں"۔ حضرت عمرؓ اُسی وقت

بہن کے گھر پہنچے اور انھیں خوب مارا پیٹا۔ یہاں تک کہ وہ زخمی ہوگئیں۔ اس عالم میں کہ اس نیک بی بی کے بدن سے لہو جاری تھا' وہ بولیں" عمر! تم جو چاہو' کرو۔ اسلام اب دل سے کہیں نکل سکتا ہے"۔ بہن کے اس جملے سے عمرؓ متاثر ہوئے اور نرم پڑ گئے ان کے اصرار پر ان کی بہن نے قرآن شریف کی آیتیں سنائیں۔ جنھیں سن کر عمر کے دل میں ایمان کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہاں سے سیدھے کاشانۂ نبوت میں پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کر لیا۔ حضورؐ کو عمرؓ کے اسلام لانے کی اتنی خوشی ہوئی کہ بے ساختہ" اللہ اکبر" کا نعرہ بلند فرمایا۔ تمام صحابہؓ نے اس مقدس نعرے کی لے میں لے ملا دی' جس کے شور سے مکے کی پہاڑیاں گونج اٹھیں

حضرت عمرؓ مزاج کے سخت اور تند و تیز تھے۔ اسلام لانے کے بعد یہ سختی اور تیزی اسلام کی حمایت میں صرف ہوئی۔ آپؓ نے اپنے اسلام کا کھُل کر اعلان کیا' اور چند مسلمانوں کو ہمراہ لے کر حرمِ کعبہ میں نماز ادا کی۔ عمرؓ بن خطاب کا اسلام لانا کفر کی شکست اور اسلام کی فتح و نصرت کا پیش خیمہ تھا۔ حضورؐ نے عمرؓ کے مسلمان ہونے کی دعا بھی تو کی تھی۔ کس قدر خوش نصیب تھے عمر فاروقؓ کہ ان کا ایمان اور اسلام مطلوبِ رسولؐ تھا۔

دوسرے مسلمانوں کی طرح حضرت عمرؓ نے بھی مکے کی سرزمین میں کفار قریش کے ظلم و ستم برداشت کیے اور طرح طرح کی سختیاں اٹھائیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے مدینے کو ہجرت کی اور اس شان سے کی کہ مشرکینِ مکہ کی بھیڑ سے بے باکانہ گزرتے ہوئے خانۂ کعبہ پہنچے۔ نہایت اطمینان کے ساتھ طواف کیا اور نماز پڑھی۔ اس کے بعد

مشرکین سے مخاطب ہو کر فرمایا "میں مدینے جا رہا ہوں۔ کسی کو ہمت ہو تو مجھے روکنے کے لیے سامنے آئے۔" یہ سن کر کفارِ قریش سہم گئے اور عمرؓ کو ٹوکنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ دوسرے مہاجرین کے ساتھ آپؓ مدینہ روانہ ہوئے۔

مکی دور مسلمانوں کی مظلومیت کا دور تھا۔ مدنی دور اسلام اور مسلمانوں کے غلبے اور نصرت و فتح مندی کا دور تھا۔ ہجرت مدینہ کے بعد کافروں سے جنگیں بھی ہوئیں۔ ان سے معاہدے بھی کیے گئے۔ اسلام کی اشاعت کے لیے ہر طرح کی کوششیں بھی کی گئیں۔ حضرت عمرؓ فاروق نے تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں شرکت کی اور اپنی بہادری، دلیری اور بےباکی کے خوب جوہر دکھائے۔

حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے حضرت عمرؓ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ جب آپؐ کا وصال ہوا تو عمر فاروقؓ کے دل پر اتنا شدید اثر ہوا کہ تلوار کھینچ کر کھڑے ہو گئے اور اعلان کیا کہ "جو کوئی یہ کہے گا کہ محمدؐ وفات پا گئے ہیں، میں اس کا سر تلوار سے قلم کر دوں گا۔"

حضرت عمر فاروقؓ کا شمار ممتاز ترین صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ مدینے میں جب نماز کے لیے مسلمانوں کو بلانے کا مسئلہ درپیش ہوا اور لوگوں نے اس سلسلے میں مختلف رائیں دیں تو حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ "نماز کے اعلان کے لیے ایک آدمی کو کیوں نہ مقرر کر دیا جائے۔" حضورؐ نے عمرؓ فاروق کی اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم فرمایا۔

حضرت عمر فاروقؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی تھے۔ حضورؐ دنیا سے رخصت ہوتے وقت تک عمرؓ بن خطاب سے خوش رہے۔ حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو "فاروق" کا خطاب عنایت فرمایا۔ واقعی عمرؓ بن خطاب کی ذات حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں آپؓ کو معتمد علیہ، مشیر اور رفیق کی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ کی اصابتِ رائے اور مشورے پر اعتماد تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی وصیت کے مطابق ان کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ۲۲ جمادی الثانی ۱۳ھ بروز سہ شنبہ مدینے میں تمام صحابہؓ نے بیعت کی۔ حضرت عمر فاروقؓ میں فطری طور پر تندی و تیزی پائی جاتی تھی۔ آپؓ کی اس مزاجی کیفیت نے اسلام کو غالب کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا۔ کیسا ہی نازک موقع اور سخت معرکہ کیوں نہ ہو، حضرت عمرؓ فاروق پریشان نہ ہوتے تھے، بلکہ حوادث سے ٹکرا کر تو ان کی شانِ جلالت اور چمک اٹھتی تھی۔

زمامِ خلافت سنبھالنے کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا:

> "مجھے معلوم ہے کہ لوگ میری سختی سے ڈرتے اور میری درشتی سے لرزہ براندام رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عمرؓ اس وقت بھی ہم پر سختی کرتا رہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ ہمارے سروں پر تھا۔ پھر اس وقت بھی ہم سے سختی کے ساتھ پیش آتا رہا جب ہمارے اور اس کے درمیان حضرت ابوبکرؓ حائل تھے۔ لیکن اب کیا ہوگا، جبکہ تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں

جو کوئی بھی ایسی باتیں کہتا ہے، وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر و باریاب رہنے اور حضورؐ کی مصاحبت کا شرف حاصل تھا۔ میں سرکارِ دو عالم علیہ الصلٰوۃ والسلام کا مطیع و فرماں بردار اور ادنیٰ چاکر تھا اور کوئی نہ تھا جو نرمی اور رحم دلی میں آپؐ کو پہنچ سکتا، جیساکہ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے: "وہ مومنین کے لیے راحت و رحمت کا سرچشمہ ہیں"۔ بارگاہِ رسالت میں میری حیثیت ایک برہنہ شمشیر کی سی تھی جب حضورؐ چاہتے، مجھے نیام میں فرمالیتے اور جب چاہتے اذنِ کار عطا فرماتے۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسی طرح رہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یاد فرمالیا۔ حضورؐ آخر وقت تک مجھ سے خوش رہے۔ اس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس سعادت پر مجھے فخر ہے"۔

"اس کے بعد مسلمانوں کی زمامِ کار ابوبکرؓ صدیق کے سپرد کی گئی، جن کے تحمل، کرم اور نرمی سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور میں ان کا بھی اطاعت کیش اور مددگار و رفیق رہا۔ اپنی سختی کو ان کی نرمی میں سمو دیتا۔ میں ایک برہنہ شمشیر تھا جسے وہ نیام میں کر لیتے تھے یا اپنا کام کرنے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ میں اسی طرح ان کے ساتھ بھی رہا۔ یہاں تک کہ اللہ ذوالجلال نے انھیں ہم سے

جدا کر دیا، وہ دمِ واپسیں تک مجھ سے خوش رہے ــــ اور ــــ اے لوگو! اب تمھارے معاملات کی ذمّے داری میرے شانوں پر رکھ دی گئی ہے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ سختی اب نرمی میں بدل گئی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لیے بدستور قائم ہے، جو مسلمانوں پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو امن و سلامتی سے رہتے اور جرأتِ ایمانی رکھتے ہیں۔ سو ان کے لیے میں سب سے زیادہ نرم ہوں۔ اگر کوئی کسی پر ظلم یا کسی کے ساتھ زیادتی کرے گا تو میں اُس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا، جب تک اُس کا ایک رُخسار زمین پر نہ ٹکا دوں اور دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں نہ رکھ دوں تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔"

"لوگو! مجھ پر تمھارے چند حقوق ہیں جو میں تمھارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کرو۔ مجھ پر تمھارا یہ حق ہے کہ جب تم میں سے کوئی میرے پاس آئے تو مجھ سے اپنا حق لے کر جائے۔ مجھ پر تمھارا یہ حق ہے کہ تمھارے خراج اور اس غنیمت میں سے جو اللہ تعالیٰ تمھیں عطا کرے کوئی چیز ناحق نہ لوں۔ مجھ پر تمھارا یہ حق ہے کہ (انشاء اللہ) میں تمھارے عطیات و وظائف میں اضافہ اور تمھاری سرحدوں کو مستحکم کر دوں اور مجھ پر تمھارا یہ حق ہے کہ تمھیں ہلاکت میں نہ ڈالوں۔ تمھیں گھر واپس آنے سے نہ روکے رکھوں

اور جب تم جنگ پر جاؤ، تو ایک باپ کی طرح تمہارے اہل وعیال
کی نگہداری کروں"۔

"اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو۔ مجھ سے درگزر کر کے میرا ہاتھ بٹاؤ۔
نیکی کے احکامات کی تعمیل کرانے اور برائی سے روکنے میں میری مدد کرو
اور تمہاری جو خدمات اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہیں۔ ان کے متعلق
مجھے نصیحت کرو۔ میں تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں اور اپنے اور
تمہارے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر رہا ہوں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جو تعلیم و تربیت دی تھی اور اپنے فیضِ صحبت سے نوازا تھا، اُس کے نشانات و آثار اس خطبے میں واضح طور پر نظر آرہے ہیں۔

حضرت عمر فارُوق رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت اپنی برکتوں کے علاوہ اس اعتبار سے بھی ممتاز ہے کہ بہت سے ملک فتح ہو کر اسلامی حکومت میں شامل ہوئے نجد، حجاز اور یمن کے علاوہ مصر، عراق، بیت المقدس، جزیرۂ خوزستان، آرمینیہ، آذربائیجان فارس، کرمان، خراسان اور مکران خلافتِ فارُوقی کے زیرِ نگین تھے۔ اسلام کے غلبے کا یہ عالم تھا کہ اس وقت دنیا کی جو طاقت بھی مسلمانوں سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو گئی۔

دنیا میں بہت بڑے بڑے فاتح اور کشور کشا گزرے ہیں، لیکن "جب سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے۔ آج تک کوئی شخص ایسا فاتح و کشور کُشا نہیں گزرا جو فارُوقِ اعظم کے برابر فتوحات اور عدل دونوں کا جامع ہو"۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کے مشہور و معروف سپہ سالار اور حضرت عمرؓ کے ماموں زاد بھائی تھے، ان کو آپؓ نے معزول کر دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ بڑے نفسیات شناس تھے اور حالات کے مطالعے اور تجربے میں بڑی دقّتِ نظر سے کام لیتے تھے۔ آپؓ نے محسوس کیا کہ مسلسل فتوحات کے سبب لوگ خالدؓ کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا کہ عوام میں یہ مقبولیت اور گرویدگی کہیں حضرت خالدؓ کے نفس کو فریب میں مبتلا نہ کر دے۔ دوسرے خالدؓ کو معزول کر کے آپؓ نے مسلمانوں کے ذہن میں اس عقیدے کو اور زیادہ راسخ کر دیا کہ انسانوں کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسا کرنا چاہیے؛ جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔

اس وقت جب کہ اسلامی فوج کی کمان حضرت خالدؓ کے ہاتھ میں تھی اور وہ عوام اور فوج میں بے حد مقبول تھے۔ حضرت عمرؓ کا انھیں معزول کر دینا، آپؓ کی فرمانروائی کی زبردست قوت کی دلیل ہے۔ دوسری طرف خالدؓ کا کردار یہ ہے کہ انھوں نے خلیفہ کے حکم کی بے چون و چرا اطاعت کی۔ کتنے نیک نفس تھے خالدؓ اور کیا سطوت و جلال تھا عمر فاروقؓ کا۔ (رضی اللہ عنہما)۔

حضرت ابو عبیدہؓ نے (جو خالدؓ کی جگہ سپہ سالار مقرر کیے گئے تھے) شام کے بہت سے علاقے فتح کر لیے۔ انھوں نے جب بیت المقدس کا رُخ کیا تو وہاں کے عیسائی قلعہ بند ہو کر جنگ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اسلامی لشکر کے محاصرے سے تنگ آ گئے اور انھوں نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی کی۔ اس صلح کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ خلیفہ خود تشریف لائیں اور صلح نامہ خود وہ اپنے ہاتھ سے قلم بند فرمائیں۔ اس اطلاع

کے ملنے پر حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا۔ حضرت عثمانؓ نے مشورہ دیا کہ عیسائی جی چھوڑ چکے ہیں۔ آپؓ ان کی اس شرط کو ٹھکرا دیں گے تو وہ اپنے کو اور زیادہ مجبور محسوس کریں گے اور کسی شرط کے بغیر ہتھیار ڈال دیں گے، لیکن حضرت علیؓ نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا اور حضرت عمرؓ کو بیت المقدس جانے کا مشورہ دیا حضرت عمرؓ نے علیؓ مرتضیٰ کی رائے کو پسند کیا (اور حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے بارے میں فرمایا "اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا"۔ فاروقِ اعظمؓ کی زبان سے یہ اعتراف ہے علیِ مرتضیٰ کے مشوروں کی صداقت اور اصابتِ رائے کا) اور جب سفر کی تیاریاں مکمل ہو گئیں، تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور ۱۶ھ رجب کے مہینے میں مدینے سے بیت المقدس کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہ سفر کسی بادشاہ کا سفر نہیں۔ خلیفۃ الرسول اللہ، امیر المؤمنین عمرؓ بن خطاب کا سفر تھا۔ کوئی تزک و احتشام اور دھوم دھڑ کا نہیں۔ ایک اونٹنی، اُس پر زادِ راہ کے لیے دو تھیلے تھے: ایک میں کھجور، دوسرے میں ستّو اور ایک مشکیزہ پانی کا تھا جب یہ فاتحِ کشور کشا اور عظیم الشان اسلامی حکومت کا والی اور فرماں روا بیت المقدس میں داخل ہوا تو اس کے جسم پر جو کرتا تھا، اُس میں ایک دو نہیں چودہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ مسلمان جرنیلوں نے جو استقبال کے لیے کھڑے تھے، سواری اور کرتا تبدیل کرنے کو کہا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "خدا نے جو تمھیں عزت دی ہے، وہ اسلام سے ہے۔ اس کے سوا ہمیں کچھ اور نہیں چاہیے"۔

وہاں پہنچ کے آپؓ نے باشندگانِ بیت المقدس کو ان کی درخواست کے مطابق امن و امان کا یہ پروانہ لکھ کر دیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے بندے، امیرالمؤمنین عمرؓ نے اہلیاء کے لوگوں کو دی۔ یہ امان ان کی جان و مال، گرجا، صلیب، تندرست بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے۔ اس طرح کہ ان کے گرجاؤں کو مسکن نہیں بنایا جائے گا۔ نہ وہ ڈھائے جائیں گے نہ انھیں، یا ان کے احاطوں کو نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ نہ ان میں سے کسی کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی جائے گی۔ اہلیاء میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے۔ اہلیاء والوں پر فرض ہے کہ وہ شہریوں کی طرح جزیہ دیں اور یونانیوں اور رومیوں کو نکال دیں۔ ان یونانیوں میں سے جو شخص نکلے گا، اس کی جان اور مال کو امن ہے تاآنکہ وہ پناہ گاہ میں پہنچ جائے لیکن اسے جزیہ دینا ہوگا اور اہلیاء والوں میں سے جو لوگ جان و مال لے کر یونانیوں کے ساتھ چلا جانا چاہیں انھیں، ان کے گرجاؤں اور صلیبوں کو امن ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی پناہ گاہ تک پہنچ جائیں۔ اہلیاء میں دوسرے ملکوں کے جو لوگ ہیں ان میں سے

اگر کوئی یہاں رہنا چاہے تو وہ رہ سکتا ہے۔ اسے بھی اہلیاء والوں کی طرح جزیہ دینا ہو گا۔ اگر کوئی رومیوں کے ساتھ جانا چاہتا ہے تو چلا جائے اور اگر کوئی اپنے اہل وعیال میں واپس ہونا چاہے تو واپس ہو جائے۔ ان سے کوئی چیز نہیں لی جائے گی۔ یہاں تک کہ اُن کی کھیتیاں کٹ جائیں اور جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر خدا کا، رسولؐ کا، خلفاءؓ کا اور مسلمانوں کا ذمّہ ہے۔ بشرطیکہ یہ لوگ مقررہ جزیہ ادا کرتے رہیں''

اس ''امن نامے'' کے خاتمے پر حضرت عمرؓ نے اپنی مہر ثبت فرمائی۔ یہ وہ دستاویز ہے، جس سے حضرت عمرؓ کی امن پسندی، وسیع النظری، عالی حوصلگی اور انسانیت دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ فیاضانہ اصول ہیں، جنھوں نے دشمنوں کے دلوں میں اسلامی فرماں رواؤں کے لیے عزت کا مقام اور احترام و ہمدردی کی گنجائش پیدا کر دی۔

اس معاہدے کے بعد تاریخ کے سینے میں یہ واقعہ بھی محفوظ ہے کہ حضرت عمرؓ گرجا کی سیڑھیوں پر تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ آپؓ سے گرجا میں نماز ادا کرنے کے لیے کہا گیا لیکن فاروقِ اعظمؓ نے جواب دیا ''کہ اگر میں نے اس گرجا میں آج نماز ادا کی تو مسلمان میرے اس فعل کی تقلید میں یہاں نمازیں پڑھا کریں گے اور پھر اس کا امکان ہو جائے گا کہ وہ عیسائیوں کو ان کے گرجاؤں سے نکال کر اس عہدِ امان کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں''۔

۱۸ھ کے آغاز سے لے کر دوسرے سال تک تمام ملک پر طاعون کی

وبا، اور قحط مسلط رہا۔ نو مہینے تک بارش نہیں ہوئی۔ کھیتیاں جل گئیں۔ درخت سوکھ گئے۔ مویشی ہلاک ہو گئے اور ہزاروں انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ اس زمانے میں حضرت عمرؓ نے تمام لذیذ چیزوں، گوشت، مچھلی وغیرہ کا کھانا ترک کر دیا۔ صرف زیتون کے تیل سے روٹی کھاتے اور وہ بھی سیر ہو کر نہیں کثرت سے فاقے کرتے۔ قحط کے زمانے میں لوگوں کو غذا مہیا کرنے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو تدابیر اختیار فرمائیں وہ آپؓ کی ایمانی فراست، حسنِ تدبیر اور بیدار مغزی کی دلیل ہیں۔ قحط کے دوران میں حضرت عمرؓ نے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا موقوف کر دی۔ آپؓ کے اس اجتہاد نے ایک نہایت ہی قیمتی اصول کی تشریح کر دی یہ کہ اسلام میں تعزیری قوانین، جرائم اور ملک کے حالات کے درمیان گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ سزا جاری کرنے سے پہلے حکومت کو چاہیے کہ وہ ایسے اسباب پیدا نہ ہونے دے کہ جرائم کا ارتکاب ناگزیر ہو جائے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں شراب نوشی کی سزا اسّی ۸۰ دُرّے مقرر کی۔

مصر میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ اسلامی لشکر نے اس پر حملہ کیا تو وہاں کے باشندے اس قلعے میں محصور ہو گئے۔ محصورین نے صلح اور ملکی معاہدے کے لیے سلسلہ جُنبانی کرنے سے پہلے ایک جاسوس کو اسلامی لشکر کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا۔ اس جاسوس نے اسلامی لشکر میں رہ کر حالات کا مطالعہ کیا اور اپنے لوگوں سے جا کر کہا " میں نے ایک ایسی قوم کو دیکھا ہے جس کا ہر فرد زندگی سے زیادہ موت اور غرور سے زیادہ خاکساری پر جان دیتا ہے۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو دنیا سے کوئی غرض اور دلچسپی رکھتا ہو۔ یہ لوگ زمین پر بیٹھتے ہیں۔ گھٹنوں پر کھانا رکھ کر کھاتے

ہیں۔ ان کا امیر گویا انھیں میں کا ایک فرد ہے۔ ان میں بڑے چھوٹے، آقا اور غلام کی کوئی تمیز نہیں۔ جب نماز کا وقت آتا ہے تو کوئی پیچھے نہیں رہتا۔ سب وضو کرتے ہیں اور خضوع وخشوع کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔"

اس قلعے کا سردار اپنے جاسوس کی زبانی ان حالات کو سن کر بولا قسم ہے اس ذات کی جس کی قسم کھائی جاتی ہے۔ یہ لوگ چاہیں تو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں، ان سے کوئی لڑ نہیں سکتا! اس کے بعد اہلِ قلعہ نے مسلمانوں سے صلح کر لی۔

حضرت عمرؓ نے ملک وسیاست اور معاشرت وتمدن کے گیسوؤں کو سنوارا بیت المال قائم کیا۔ فوج کا باقاعدہ دفتر بنایا۔ مالیات کے دفتر کی بنا ڈالی۔ رضاکاروں کی تنخواہیں مقرر کیں۔ ملک میں اراضی کی پیمائش کا قاعدہ جاری کیا۔ مردم شماری کرائی۔ نہریں کھدوائیں۔ شہر آباد کرائے۔ مقبوضہ ممالک کو مستقل صوبوں میں تقسیم کیا۔ حربی تاجروں کو اسلامی حکومت میں تجارت کرنے کی اجازت دی۔ مجرموں اور غلط کاروں کی تادیب کے لیے دُرّہ استعمال فرمایا۔ جیل خانہ اور پولیس کا محکمہ قائم کیا۔ راتوں کو خود گشت کر کے رعایا کے حال سے باخبر رہنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ پرچہ نویس مقرر کیے۔ راستوں کے علاوہ مسافروں کی سہولت وآرام کے لیے کنوئیں اور کارواں سرائیں بنوائیں۔ مفلوک الحال اور ضرورت مند عیسائیوں اور یہودیوں کے روزینے مقرر کیے نماز تراویح باجماعت پڑھنے کا اہتمام کیا۔ تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی۔ آپؓ نے صوبوں کے حاکموں کو لکھا کہ کسی سپاہی کو میدانِ جنگ میں مسلسل چار مہینے سے زیادہ نہ روکا جائے۔ چار مہینے گزر جانے کے بعد اُسے رخصت دی جائے کہ وہ اپنے اہل و

عیال سے مل سکے۔

حضرت عمرؓ نے تمام جلیل القدر صحابیوںؓ کے وظیفے بیت المال سے مقرر کیے حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ کی تنخواہ اپنے بیٹے عبداللہؓ سے زیادہ مقرر فرمائی۔ اس پر حضرت عبداللہؓ نے اعتراض کیا تو آپؓ نے بیٹے سے کہا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھ سے زیادہ اُسامہؓ کو اور اُسامہؓ کے باپ (حضرت زیدؓ) کو تیرے باپ سے زیادہ دوست رکھتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑے جوہر شناس تھے۔ صحابہٴ کرامؓ کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے کہ کس شخص میں کون سی خاص اور ممتاز صفت ہے۔ اسی صفت کے مطابق خدمات اور عہدے عطا کرتے۔ یہی سبب تھا کہ آپؓ کے دورِ خلافت میں حکومت کی مشین کا ہر کل پُرزہ صحیح مقام پر نصب تھا اور ٹھیک طور پر کام کرتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ کمزوروں اور محتاجوں کے حالات اور جذبات کا صحیح اندازہ میں تب ہی کر سکتا ہوں جب مجھ پر بھی وُہی کچھ بیتے، جو ان پر بیتی ہے۔ آپؓ کی صاحبزادی نے ایک مرتبہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے رزق کشادہ دیا ہے۔ مسلمانوں کی اجازت سے آپؓ اپنی ضروریات کے مطابق مالِ غنیمت سے لے لیا کریں۔ حضرت عمرؓ نے اس پر فرمایا بیٹی! تم نے یہ مشورہ دے کر اپنے باپ کو دھوکا دیا ہے۔ میرے اہل وعیال کا حق میری ذات اور میرے مال میں ہے، میری دیانت اور امانت میں نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات اور کارناموں سے

دُنیا میں عدل و انصاف پہچانا جاتا ہے۔ ایک قاضی کا جب آپؓ نے تقرر فرمایا تو اُسے خط لکھا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اللہ کے بندے امیرالمؤمنین کی طرف سے عبدُاللہ بن قیس کو سلام!

امّا بعد! قضا ایک اہم فریضہ ہے، جسے لوگ ہر زمانے میں انجام دیتے رہے ہیں۔ جب کوئی مقدمہ تمھارے سامنے پیش ہو، اس کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھو اور جب صحیح نتیجے پر پہنچ جاؤ تو اسے نافذ کردو، کیونکہ زبانی فیصلہ بے سُود ہے، جب تک اسے عملاً نافذ نہ کیا جائے۔ مدّعی اور مدعا علیہ کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرو۔ کسی فریق سے بات کرنے، یا عدالت میں بٹھانے اور انصاف کرنے میں کوئی امتیاز نہ برتو! جو شخص دعوٰی کرے اس سے گواہ مانگے جائیں اور جو دعوے کو نہ مانے اس سے قسم لی جائے۔ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانی جائز ہے۔ بشرطیکہ اس سے حرام حلال اور حلال حرام نہ ہو جائے۔ کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا اور آج اس سے بہتر فیصلہ تمھاری عقل نے سُجھا دیا تو اپنے پہلے فیصلے کو رد کر سکتے ہو۔ اس لیے کہ حق ازلی ہے اور حق سے رجوع کرنا غلطی پر اڑے رہنے سے بہتر ہے۔ جس مسئلے میں شبہ ہو اور وہ تمھیں قرآن و

حدیث میں نہ ملے تو اس پر غور کرو۔ پھر غور کرو۔ امثال و نظائر کو اچھی طرح ذہن میں رکھ کر قیاس و اجتہاد سے کام لو۔ کوئی شخص اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے مہلت مانگے تو اسے مہلت دو اور اگر وہ گواہ پیش کر دے تو اس کا حق دِلوا دو۔ ورنہ مقدمہ خارج کر دو۔ ایسا کرنے سے شک مٹے گا اور ظلم و ستم کی سیاہی دور ہوگی۔ ہر مسلمان ثقہ ہے۔ سوا ان اشخاص کے جنھیں کسی سنگین جُرم میں دُرے لگائے جا چکے ہوں۔ یا جنھوں نے جھوٹی گواہی دی ہو یا جو نسب میں مشکوک ہوں۔ تمھاری چھپی ہوئی بداعمالیوں کا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے۔ دنیا میں قانونی سزا سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے گواہی اور حلف ضروری قرار دیا ہے۔ خبردار! تمھارے طبیعت و مزاج میں اہلِ مقدمہ سے خفگی، اُکتاہٹ یا چڑچڑاپن پیدا نہ ہونے پائے کیونکہ جو شخص حق و انصاف کے موقع پر حق و انصاف قائم کرتا ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اچھی شہرت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ جس نے اپنی نیّت درست رکھی، اُس کے اور لوگوں کے درمیان اللہ کافی ہے اور جو ان سے بناوٹی اخلاق سے پیش آیا۔ اُس کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید نہ رکھو۔ والسلام"

اِس مکتوب میں حضرت عمرؓ نے عدل و انصاف کا ست نکال کے رکھ دیا ہے اللہ اللہ! تعلیمِ نبوی اور فیضانِ رسالت کی اثر پزیری!

عدل و انصاف کے معاملات میں حضرت عمر فاروقؓ امیر و غریب میں ذرہ برابر امتیاز اور رعایت روا نہ رکھتے تھے۔ تاریخ کا بہت مشہور واقعہ ہے کہ جبلہ نام کا بادشاہ جو مسلمان ہو چکا تھا، فریضۂ حج ادا کرنے آیا۔ خانۂ کعبہ کے طواف کے وقت مطاف میں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ اتفاق سے جبلہ کی چادر ایک شخص کے پاؤں تلے آگئی۔ جبلہ نے غصے میں آکر اس کی ناک پر مکہ مارا۔ شخصِ مذکور نے حضرت عمرؓ کے پاس آکر شکایت کی۔ آپؓ نے جبلہ سے فرمایا "یا تو تم اس شخص کو راضی کرو۔ ورنہ تم سے اس کا بدلہ لیا جائے گا۔" جبلہ نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ ایک معمولی آدمی ہے اور میں بادشاہ ہوں" حضرت عمرؓ نے فرمایا "اسلام نے تمھیں اور اسے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ پرہیزگاری کے علاوہ تم کسی چیز میں اس پر فضیلت نہیں پا سکتے۔" اس پر جبلہ نے ایک رات کی مہلت چاہی اور وہ راتوں رات فرار ہو گیا اور اپنے ملک میں پہنچ کر مرتد ہو گیا۔ اس طرح ایمان کی وہ چنگاری جو اس کے دل میں روشن ہوئی تھی، غرورِ شاہانہ کے گرد و غبار میں دب کر اور بجھ کر رہ گئی۔ یہ ہے عدلِ فاروقیؓ کی ایک روشن مثال کہ بادشاہ کے مقابلے میں بھی آپؓ کا انصاف بے لچک ثابت ہوا۔

حضرت عمر فاروقؓ کمزور، غریب اور حاجت مند رعایا کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کسی کے پاؤں میں کانٹا چبھتا تو اس کی کھٹک عمرؓ کا دل محسوس کرتا۔ حکومت کے عمال (گورنروں) سے روپے پیسے کے مصارف اور مالیات کا حساب سختی سے لیتے۔ عراق کے گورنر بہت زیادہ ذہین تھے اور ذرا ذرا سی بات پر احتساب کرتے تھے۔ ان کی سختیوں کی رعایا نے شکایت کی تو انھیں برطرف کر دیا۔ معزول گورنر نے

اپنی برطرفی کا سبب دریافت کیا تو امیرالمؤمنینؓ نے جواب میں فرمایا "میں نہیں چاہتا کہ تم میں جو فاضل عقل ہے، اس کا بار لوگوں پر پڑے"۔

حضرت عمرؓ جس اسلامی سلطنت کے داعی اور خلیفہ تھے، اُس کا رقبہ ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل تھا، لیکن جب کسی غیر مُلکی سفیر نے آپؓ کو تلاش کیا تو قصر و ایوان کے بجائے فرشِ خاک پر ڈنڈے یا پتھر کو تکیہ بنائے ہوئے پسینے میں شرابور ہی پایا۔ بے سادہ غذا کھاتے جو ایک مزدور کو میسّر آتی ہے۔ پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے۔ زندگی ہر قسم کے کرّوفر، نمود و نمائش اور ٹھاٹ باٹ سے خالی مگر جلال ایسا کہ کوئی شاہنشاہ بھی اس کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ عبادت و تقویٰ میں اپنی نظیر آپؓ تھے۔ خشیت الٰہی کا غلبہ تھا اور نیکی آپؓ کا شعار تھی۔

حضرت عمرؓ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں اور اپنے اہلِ خانہ کے حقوق ادا کیے۔ اپنے اہل و عیال سے آپؓ کو خاص لگاؤ اور دلی محبت تھی۔ لیکن آپؓ نے ان رشتوں اور قرابتوں کے ہجوم میں حقوق العباد اور حقوق اللہ کا پورا پورا لحاظ رکھا اور کسی کی محبت آپؓ کے دین و ایمان اور تعلق باللہ کے لیے فتنہ نہ بن سکی۔

۲۳ سنہ ہجری میں معمول کے مطابق حج بیت اللہ کے لیے گئے تو واپسی پر اپنے اونٹ کو بٹھایا۔ چھوٹے چھوٹے پتھر اور سنگریزے جمع کر کے ایک چبوترہ سا بنایا۔ اُس پر چادر بچھائی اور لیٹ گئے۔ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دُعا کی:

"یا اللہ! میری عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ ہڈیاں بھی نرم پڑ گئی ہیں۔ قوتیں جواب دے رہی ہیں۔ رعایا پھیل گئی ہے۔ اب مجھے اپنے پاس بلا لے"۔

اسی سال چہار شنبے کی صبح کو نماز کی امامت کے لیے مسجد نبوی میں تشریف لائے۔ ابھی تکبیر ہی شروع ہوئی تھی کہ ایک پارسی غلام ابولولو فیروز نے خنجر کے متعدد وار کیے۔ ایک وار زیادہ کاری پڑا۔ آپؓ زخموں کی تاب نہ لا کر زمین پر گر پڑے۔ آپؓ کے ایماء سے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے نماز پڑھائی۔ فیروز نے دوسرے لوگوں پر بھی خنجر کے وار کیے اور وہ بالآخر پکڑ لیا گیا، لیکن اس نے اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر لی۔

حضرت عمرؓ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا قاتل ایک مجوسی غلام ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ مجھے کسی ایسے شخص نے قتل نہیں کیا جو خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک سجدہ کرنے پر بھی اس حملے کو حجت بناتا۔ جب آپؓ کی حالت غیر ہونے لگی تو لوگوں نے آپؓ سے کہا کہ آپؓ اپنا جانشین منتخب فرما دیں"۔ اس پر آپؓ نے حضرت علیؓ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن وقاص، حضرت زبیرؓ بن عوام، حضرت عثمانؓ اور حضرت طلحہؓ کو طلب کیا۔ حضرت طلحہؓ مدینے میں موجود نہ تھے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ آپؓ نے باقی پانچ اصحابؓ کو مخاطب کر کے فرمایا "تین روز تک طلحہؓ کا انتظار کرنا۔ وہ اس مدت میں آجائیں تو انھیں اپنی جماعت میں شامل کر لینا۔ اگر وہ تین دن تک نہ آئیں تو پھر تم پانچوں آدمی ہی آپس میں صلاح و مشورہ کر کے کسی کو اپنا امیر بنا لینا"۔ پھر آپؓ نے متذکرہ بالا اصحابؓ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص خلافت کے لیے منتخب ہو۔ اس کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ انصار کے حقوق کا بہت لحاظ رکھے، کیونکہ یہ وہی لوگ ہیں، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی اور مہاجرین کو اپنے گھروں میں ٹھیرایا۔ انصار تمھارے محسن ہیں۔ تم کو بھی ان کے ساتھ احسان کرنا چاہیے۔ اُن کی بھول چوک سے جہاں تک ممکن

ہو درگزر اور چشم پوشی سے کام لینا۔ تم میں جس شخص کا انتخاب خلافت کے لیے ہو اُس کو مہاجرین کا بھی پاس و لحاظ کرنا چاہیے۔ اس طرح ذمیوں کا بھی پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ اس کے ساتھ اللہ اور رسولؐ کی ذمے داری کو کما حقہٗ ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ ذمیوں سے جو وعدہ کیا جائے، اُس کو ضرور پورا کیا جائے۔ اُن کے دشمنوں کو دور کیا جائے اور ان کی طاقت سے زیادہ اُن پر بار نہ ڈالا جائے۔"

اس کے بعد آپؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ سے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس جا کر رسولؐ اللہ کے پہلو میں دفن کیے جانے کی اجازت طلب کرو۔ عبداللہؓ ابن عمرؓ جب ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ حضرت عمرؓ کا پیغام سُن کر فرمایا:۔

"اس جگہ کو میں اپنے لیے محفوظ رکھنا چاہتی تھی، لیکن آج عمرؓ کو میں اپنے آپ پر ترجیح دوں گی۔"

اپنی وفات سے پہلے تمام غلام ایک ایک کر کے آزاد کر دیے اور بیت المال سے لیا ہوا قرض واپس کر دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ زخمی ہونے کے بعد پانچ دن تک زندہ رہے۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں ذی الحجہ کے آخری ہفتے یا محرم ۲۴ھ کے پہلے ہفتے میں ساڑھے دس سال حکومت کرنے کے بعد تریسٹھ سال کی عمر میں شہادت پائی۔ (اسی عمر میں سرورِ کائنات نے وفات پائی)۔ آپ کی وصیت اور خواہش و تمنا کے مطابق آپ کا جسدِ مقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ صدیق کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ حضرت عمر فاروقؓ کے جنازے پر تشریف لائے اور فرمایا:۔

"بہ خدا، کفن میں لپٹے ہوئے اس شخص سے زیادہ مجھے رُوئے زمین پر اور کوئی پسند نہیں ہے کہ اس کے نامۂ اعمال کے ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے ملوں۔"

حضرت عثمان غنی ذوالنّورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عثمانؓ کے باپ کا نام عفان تھا۔ آپؓ ہجرتِ نبوی سے سینتالیس ۴۷ سال قبل قریش کے ذی عزّت قبیلے میں پیدا ہوئے۔ آپؓ کا سلسلۂ نسب عبدمناف پر جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے۔ آپؓ کی نانی حضورؐ کی پھوپھی تھیں۔

حضرت عثمانؓ نے کم سنی ہی میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ جوان ہوکر تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ عرب کے لوگوں میں آپؓ کی صداقت، دیانت اور امانت کی خاصی شہرت تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آپؓ کے دوستانہ اور مخلصانہ روابط تھے۔ حضرت ابوبکرؓ ہی کی تبلیغ اور رفاقت وصحبت سے متاثر ہوکر حلقۂ اسلام میں شامل ہوئے جب آپؓ اسلام لائے تو آپؓ چونتیس ۳۴ برس کے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صرف پینتیس ۳۵ چھتیس ۳۶ زن ومرد مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔

اسلام لانے کے کچھ زمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منجھلی صاحبزادی حضرت رقیہؓ سے حضرت عثمانؓ کا نکاح ہوا۔ آپؓ کو اللہ تعالیٰ نے ایمان واسلام کی دولت عطا فرمادی۔ مگر ابھی تک آپؓ کے عزیز واقارب اس دولت

لاز وال سے محروم تھے۔ اس لیے آپؓ کے رشتے دار آپؓ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے خاص طور سے آپؓ کے چچا مار پیٹ کرتے۔ جب حضورؐ کی اجازت سے مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو حضرت عثمانؓ نے بھی اپنی اہلیہ سمیت ہجرت فرمائی لیکن وہاں حبشہ میں کسی نے یہ غلط خبر اڑا دی کہ تمام قریش مسلمان ہو چکے ہیں۔ اس خبر کو سن کر آپؓ مکے واپس آگئے اور یہاں آکر مصیبتیں جھیلیں۔ پھر جب مدینے کی طرف ہجرت کا حکم ہوا تو آپؓ بھی اپنے اہل و عیال سمیت مدینے چلے گئے۔ مدینے پہنچ کر کسی کے دست نگر نہیں رہے۔ تجارت شروع کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کاروبار میں خوب برکت دی۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتے نفع ہوتا۔ مدینے میں پانی کی سخت تکلیف تھی آپؓ نے ایک یہودی سے بیس ہزار درہم میں ایک کنواں خرید کر عام مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔

حضرت عثمانؓ کی اہلیہ حضرت رقیہؓ بنتِ رسولؐ شدید بیمار تھیں۔ اُن ؓ کی تیمارداری کی وجہ سے آپؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے مدینے میں رُک گئے اور غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ جب حضرت رقیہؓ کی وفات ہوئی تو آپؓ کو بہت ملال ہوا اور کہا "افسوس ہے کہ خاندانِ نبوت سے میری قرابت کا رشتہ ٹوٹ گیا"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کی دل دہی اور جمعیتِ خاطر کے لیے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت اُمِّ کلثومؓ سے نکاح کر دیا۔ اسی لیے آپؓ کا لقب "ذوالنورینؓ" (دو نوروں والے) مشہور ہوا۔

آپؓ غزوۂ اُحد اور خندق میں شریک ہوئے۔ جب حضورؐ نے غزوۂ خندق

کے بعد زیارتِ کعبہ کا قصد فرمایا تو حدیبیہ کے مقام پر معلوم ہوا کہ مشرکین آمادۂ فساد ہیں۔ حضورؐ نے آپؓ کو سفیر بنا کر مکے بھیجا۔ جہاں آپؓ کو کفار نے روک کے رکھا اور یہ مشہور کر دیا کہ آپؓ شہید کر دیے گئے ہیں۔ اس خبر کے ملتے ہی حضورؐ نے آپؓ کا قصاص لینے کے لیے چودہ سو صحابہؓ سے ایک درخت کے نیچے بیعت لی۔ آخر مشرکینِ مکہ نے مسلمانوں کے جوش و عزم کی اطلاع پا کر حضرت عثمانؓ کو چھوڑ دیا اور صلح کر لی۔

شام کے سوداگر روغنِ زیتون کی تجارت کے لیے مدینے آیا جایا کرتے تھے۔ انھوں نے اطلاع دی کہ رومیوں نے عرب پر چڑھائی کرنے کے لیے بہت بڑا لشکر جمع کر لیا ہے۔ دوسرے ذریعے سے بھی اس خبر کی تصدیق ہو گئی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس موقع پر حضورؐ نے مالی اعانت کے لیے صحابہؓ سے اپیل کی۔ حضرت عثمانؓ نے ایک تہائی فوج کے اخراجات و مصارف کی ذمے داری قبول کی اور کئی سو اونٹ، ستر گھوڑے اور رسد کے لیے ایک ہزار دینار پیش کیے۔ حضرت عثمانؓ کی جہاد فی سبیل اللہ میں اس مالی اعانت اور فیاضی سے حضورؐ بہت خوش ہوئے۔

حجۃ الوداع میں عثمانؓ بن عفان حضورؐ کے ہمراہ تھے۔ خلافتِ صدیقی میں مجلسِ شوریٰ کے معتمد رکن تھے اور جب حضرت ابوبکرؓ نے رحلت کی تو حضرت عمرؓ کے خلیفہ ہونے کا وصیت نامہ حضرت عثمانؓ ہی نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔ دوسرے اکابر صحابہؓ کی طرح آپؓ بھی قرآنِ کریم کو اپنے حافظے اور سینے میں محفوظ کیے ہوئے تھے، اور چونکہ آپؓ کاتبِ وحی بھی تھے اس لیے آیاتِ قرآنی کے شانِ نزول اور مفہوم و منشا

سے واقف تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں آپؓ سے دینی مسائل میں فتویٰ لیا جاتا اور آپؓ وراثت کے مقدمات کا خاص طور سے فیصلہ کرتے حضرت عثمانؓ غنی بڑے دیانت دار اور راست باز تھے۔ تجارت کا کاروبار بہت بڑے پیمانے پر تھا، لیکن لین دین اور خرید و فروخت میں ہمیشہ انصاف، دیانت اور سچائی سے کام لیا۔ طبیعت میں رحم و شفقت کا جوہر بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا۔ ایامِ جہالت میں شراب اہلِ عرب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس دور میں بھی حضرت عثمانؓ کے ہونٹ جامِ شراب سے ناآشنا ہی رہے۔

خشیتِ الٰہی کا یہ عالم کہ اکثر و بیشتر آبدیدہ رہتے۔ موت، قبر اور آخرت کا خیال ہمیشہ دامن گیر رہتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاء کو ایمان کی شاخ قرار دیا ہے اور شرم و حیا حضرت عثمانؓ کا امتیازی وصف تھا۔ حضورؐ فرماتے تھے کہ "عثمانؓ کی حیا سے فرشتے بھی شرماتے ہیں"۔ آپؓ تنہائی، بند کمرے یہاں تک کہ غسل کرتے میں بھی برہنہ نہ ہوتے۔ آپؓ ہر جمعے کو ایک غلام آزاد کرتے۔ رات کو عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ دوسرے تیسرے دن عموماً روزہ رکھتے۔ ہر سال حج کرتے اور امیرِ حج کے فرائض خود انجام دیتے۔ بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری کرتے۔

عرب میں آپؓ سب سے زیادہ دولت مند تھے۔ دولت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو فیاض طبع اور دل کا سخی بھی بنایا تھا۔ آپؓ کے مال سے اسلام کو اُس وقت فائدہ پہنچا۔ جب روپے پیسے کی سخت ضرورت تھی۔ اسی دولت و ثروت، فیاضی اور اسلام کی مالی خدمت اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے سبب آپؓ

"غنی" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ مدینے سے متصل بقیع میں ایک وسیع قطعۂ زمین خرید کر مسلمانوں کے قبرستان کے لیے وقف کر دیا۔

حضرت عثمانؓ کے پاس بہت سے نوکر چاکر تھے، مگر اس کے باوجود رات کو نماز تہجد کے لیے اُٹھتے تو کسی نوکر کو نہ جگاتے۔ وضو کا انتظام خود ہی کر لیتے۔ آپؓ کو مسجدِ نبوی میں کنکریوں پر سوتے ہوئے بھی دیکھا گیا جس سے جسم پر کنکریوں کے نشانات اُبھر آتے تھے۔ عشقِ رسولؐ کا یہ عالم تھا کہ جب حدیبیہ سے حضورؐ کے فرمان کے مطابق سفیر بن کر مکے گئے ہیں تو قریش نے خود درخواست کی کہ یہاں آئے ہو تو کعبے کا طواف بھی کر لو، مگر حضرت عثمانؓ نے کہا "یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو طواف سے روکے گئے ہوں اور میں حضورؐ کے بغیر طواف کر لوں"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے انتخاب کے لیے جن چھ صحابیوںؓ کی مجلسِ شوریٰ نامزد کی تھی، اُن میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ حضرت عثمانؓ بھی تھے۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں جو صحابہؓ "اصحابِ فتویٰ" تھے اور جن کے تفقہ پر اُمت کو اعتماد تھا، اُن میں سرِفہرست حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کا نام نظر آتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا، جس پر دو دن تک بحث اور گفتگو ہوتی رہی اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ صورتِ حال کی اس نزاکت کو دیکھ کر بالآخر حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف جو جلیل القدر صحابی تھے دوسرے صحابہؓ کے ساتھ مسجدِ نبوی میں آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن نے مختصر سا

خطبہ ارشاد فرمایا اور اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جو صحابہ وہاں موجود تھے، اُن سب نے اِس فیصلے پر اتفاق کیا۔ جس دِن آپؓ نے زمامِ خلافت سنبھالی ہے، ۲۴ھ، محرم کا مہینہ اور دوشنبے کا روز تھا۔ تقریبًا ایک سال تک آپؓ نے خلافت کا نظم ونسق حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت کے مطابق چلایا۔ اس کے بعد وقت کے تقاضوں کے مطابق چند تبدیلیاں بھی کیں نرمی اور ملاطفت میں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی مثال قائم کی۔

حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہونے ہی حضرت عمر فاروقؓ کے مفتوحہ علاقوں میں باغیوں اور شورش پسندوں نے سر اٹھایا۔ ان بغاوتوں اور شورشوں کو حضرتِ عثمانؓ نے حسنِ تدبیر کے ساتھ فرو کیا اور آہستہ آہستہ انھیں تالیفِ قلب اور لُطف وکرم سے منقاد و مطیع بنالیا۔ عہدِ عثمانی میں اسلامی مملکت وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ برقہ، طرابلس اور مراکش فتح ہوے۔ ایران کی فتح مکمل ہوئی۔ افغانستان، خراسان اور ترکستان کا ایک حصہ اسلامی حکومت میں شامل ہوا۔ آرمینیا اور آذربائیجان کی فتح نے اسلامی سرحد کو کوہ قاف تک پھیلا دیا اور ایشیاے کوچک کا ایک وسیع خطہ ملکِ شام میں شامل کر لیا گیا۔ بحری فتوحات کا آغاز حضرت عثمانؓ ہی کے عہدِ خلافت میں ہوا۔ آپؓ نے صُوبہ جات اور اضلاع (Districts) کی مناسب طور پر تقسیم کی اور افسرِ فوج کا ایک جدید عہدہ قائم کیا۔ اب تک یہ کام صوبے کے حاکم سے متعلق تھا اور اسے دوہری ذمے داری انجام دینا پڑتی تھی آپؓ کے عہدِ خلافت میں عمال (گورنروں) سے دریافتِ حال کے لیے اکابر صحابہؓ کے تحقیقاتی

وفود روانہ کیے جاتے جو تمام ممالک محروسہ کا دورہ کر کے عمّالِ حکومت کے طرزِ عمل اور رعایا کے حالات کے پیشِ نظر مناسب تدبیریں اختیار کرتے تاکہ ہر طرح سے امن و امان قائم رہے۔ حضرت عثمانؓ کا یہ معمول تھا کہ جمعے کے دن خطبہ شروع کرنے سے پہلے لوگوں سے اطرافِ ممالک کی خبریں سنتے۔ عمّالِ حکومت کو سال کے سال حج کے موقع پر دارالحکومت میں حاضری دینی پڑتی اور جس کسی کو اُن کے خلاف کوئی شکایت ہوتی، خلیفۃ المسلمینؓ کے سامنے آزادی کے ساتھ بیان کرتا۔ اسلامی ریاست کے جو محکمے قائم ہو چکے تھے، اُن کو آپؓ نے ترقی دی اور انھیں پہلے سے زیادہ مضبوط بنایا۔ جدید فتوحات سے آمدنی میں اضافہ ہوا تو اس کے ساتھ مصارف بھی بڑھے۔ آپؓ نے رفاہِ عام کی خاطر سڑکیں، پُل، چوکیاں اور سرائیں تعمیر کرائیں اور پانی کے چشموں کو بھی درست کرایا۔ خیبر کی سمت سے مدینے میں کبھی کبھی سیلاب آجاتا جس سے شہری آبادی کو نقصان پہنچتا۔ آپؓ کے حکم سے اس مصیبت سے لوگوں کو بچانے کے لیے مدینے سے تھوڑی دور پر ایک بند بندھوایا گیا اور نہر بھی کھودی گئی تاکہ سیلاب آئے تو اُس کا رُخ مدینے کی جانب نہ ہو۔

آپؓ کے عہد کا سب سے بڑا دینی کارنامہ قرآنِ پاک کو اختلافِ قراءۃ سے محفوظ کر کے ایک قراءت پر جمع کرنا ہے۔ اگر آپؓ کے عہد میں یہ کام نہ ہوتا تو قرآن شریف بھی دوسری آسمانی کتابوں کی طرح اختلاف کا مجموعہ بن جاتا۔

تعمیرات کے سلسلے میں حضرت عثمانؓ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مسجدِ نبوی جو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی اور کثرت کے سبب ناکافی تھی، اُس کو آپؓ نے وسیع

کیا۔ توسیعِ مسجد کی نگرانی کے لیے عمالِ حکومت کو بلایا اور خود دن رات مصروف رہے غرض دس مہینے مسلسل کام ہوتا رہا اور اس کے بعد اینٹ، چونا اور پتھر کی نہایت خوشنما اور مستحکم عمارت تیار ہو گئی۔ آپؓ نے تمام ملک میں اونٹوں اور گھوڑوں کے چرنے کے لیے چراگاہوں کا بندوبست کیا۔ ان تمام انتظامات کے باوجود حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں حکومت کی مشین جس قدر چست تھی، اس میں سستی پیدا ہو گئی۔

حضرت عثمانؓ کے بارہ سالہ دورِ خلافت کا نصف زمانہ یعنی شروع کے چھ سال کامل امن وامان سے گزرے مگر آخری چھ سالوں میں یہ امن وامان، فتنہ و انتشار میں بدل گیا۔ آپؓ کے دور میں مجوسیوں اور یہودیوں نے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے اور اسلامی حکومت میں انتشار پھیلانے کے لیے طرح طرح کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں کیں۔ جب دشمن اور مفسد غمخوار و ہمدرد بن کر سازشیں کرتے ہیں تو بعض سیدھے سادے نیک لوگ بھی ان کے دام میں آجاتے ہیں۔ یہی صورتِ حال خلافتِ عثمانی میں پیش آئی۔ حضرت عثمانؓ فطرۃً نیک، نرم خو، فیاض اور صاحبِ تحمل تھے۔ اس سے شرارت پسندوں کے حوصلے بڑھے۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ اور حضرت عمرِ فاروقؓ کے دور میں امامِ وقت کی اطاعت کا جو دینی جذبہ پایا جاتا تھا، اب اس میں کمی آگئی تھی۔ عجمی قوموں کے نومسلموں کی اولاد بھی خلافتِ عثمانیؓ کے فتنوں اور ریشہ دوانیوں میں شریک رہی۔ لوگ عمال کے خلاف ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ کو بدنام کرنے اور عوام میں نامقبول بنانے کی مہم شروع کی گئی۔ یہ ایک ایسی آگ تھی جو جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی

اور بڑھتی ہی چلی گئی۔

حضرت عثمانؓ پر یہ اعتراضات کیے گئے کہ آپؓ نے کبار صحابہؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے خاندان کے نااہل اور ناتجربہ کار افراد کو مامور کیا۔ بیت المال میں تصرفِ بےجا کو روا رکھا۔ چند صحابہؓ کے روزینے بند کر دیے۔ مدینے کے اطراف میں نقیع کو سرکاری چراگاہ قرار دے کر عوام کو مستفید ہونے سے روک دیا۔ اپنے حاشیہ نشینوں اور قرابت داروں کو وسیع قطعاتِ زمین عطا کیے۔ بعض کبار صحابہؓ کو شہر بدر کر دیا۔ شرعی حدود کے اجراء میں تساہل برتا۔ دین میں بدعتیں پیدا کیں۔ مصری وفد کے ساتھ عہد و پیمان کا پاس و لحاظ نہیں رکھا۔ ان الزامات کی تردید میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عام مسلمانوں کے رُوبرو تقریر فرمائی:-

"لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے خاندان والوں سے محبت کرتا ہوں اور ان کے ساتھ میرا سلوک فیاضانہ ہے، لیکن میری محبت نے مجھے ظلم اور ناانصافی کی طرف مائل نہیں کیا، بلکہ میں اُن کے صرف واجبی حقوق ادا کرتا ہوں۔ اسی طرح میری فیاضی بھی میرے اپنے مال تک محدود ہے۔ مسلمانوں کا مال نہ میں اپنے لیے حلال سمجھتا ہوں نہ دوسروں کے لیے۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ اور عمرؓ کے عہد میں بھی اپنے مال سے گراں قدر عطیے دیا کرتا تھا۔ اور اب جبکہ میں اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکا ہوں۔ زندگی ختم ہونے کے قریب ہے اور اپنا تمام سرمایہ اپنے اہل و عیال کے سپرد کر چکا

ہوں۔ مفسدین ایسی باتیں مشہور کرتے ہیں۔ خدا کی قسم! میں نے کسی شہر پر خراج کا کوئی ایسا بار نہیں ڈالا کہ اس طرح کے الزام کے لیے کوئی وجہ جواز مل سکے اور جو کچھ وصول ہوا وہ انھیں لوگوں کے رفاہ و بہبود پر صرف ہوا۔ میرے پاس صرف خمس آتا ہے اور اس سے بھی میرے لیے کچھ لینا جائز نہیں ہے۔ مسلمانوں نے اس کو میرے مشورے کے بغیر مستحقین پر صرف کیا۔ بیت المال میں سے ایک پیسے کا بھی تصرف نہیں کیا جاتا۔ میں اس سے کچھ نہیں لیتا۔ یہاں تک کہ اپنے مال سے کھاتا پیتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ تو نے مخصوص چراگاہیں بنائی ہیں، حالانکہ خدا کی قسم! میں نے اسی چراگاہ کو مخصوص قرار دیا ہے جو مجھ سے پہلے "خاص" کی جا چکی تھی۔ میں نے چراگاہ کو مسلمانوں کے صدقے (رفاہِ عام) پر محدود کر دیا۔ اس کو چراگاہ اس لیے بنایا کہ والیِ صدقہ اور کسی دوسرے کے درمیان نزاع کی نوبت نہ آئے۔ پھر کسی کو نہ منع کیا اور نہ ہٹایا۔ میرے پاس اس وقت دو اونٹنیوں کے سوا اور کوئی مویشی نہیں ہے۔ حالانکہ جس وقت خلافت کا بارِ گراں میں نے اپنے سر لیا ہے تو میں عرب میں سب سے زیادہ اونٹ اور بکریاں رکھتا تھا اور آج ایک اونٹ اور ایک بکری تک نہیں ہے۔ یہ دو اونٹ جو رہ گئے ہیں وہ حج کی سواری کے لیے ہیں۔"

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے تراشے ہوئے الزامات کی تردید اور اپنی صفائی میں نہایت معقول تقریر کی، جس سے یہ بدگمانیاں دور ہو جانی چاہییے تھیں لیکن شورش دبنے کے بجائے اور بڑھ گئی۔ آپؓ نے شورش کو رفع کرنے اور فتنہ وفساد کو دبانے کے لیے آخری کوشش یہ کی کہ تمام عمال حکومت کی مشاورتی کمیٹی طلب کی اور ان سے رائیں لیں کہ حالات کو بہتر بنانے اور اس انتشار کو رفع کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں، مگر کسی کی رائے اور تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہوئی اور وہی ہو کر رہا جو روزِ ازل مقدر ہو چکا تھا۔

دوسرے شہروں میں تو مفسدین شورش برپا کر ہی رہے تھے مگر سب سے بڑی مصیبت کی بات یہ تھی کہ خود شہر مدینہ میں بھی مفسدین پائے جاتے تھے۔ بیرونی شورش پسندوں کی کمک ان کو ملتی رہتی تھی۔ اس لیے وہ اس درجہ بے باک ہو گئے تھے کہ امیر المؤمنینؓ بھی ان کی دست درازیوں سے محفوظ نہ تھے۔ ایک بار حضرت عثمانؓ منبر پر جمعے کا خطبہ دے رہے تھے۔ ابھی حمد و ثناء کا آغاز ہی تھا کہ ایک شخص نے مجمع میں سے اٹھ کر کہا "عثمانؓ! کتاب اللہ کو اپنا طرزِ عمل بنا۔" حضرت عثمانؓ کے تحمل اور درگزر کا یہ عالم تھا کہ آپؓ نے اس شخص کے دخل درمعقولات کی ذرا بھی پروا نہ کی، بلکہ بڑی نرمی سے اُسے بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ وہ شخص بیٹھ تو گیا مگر تھوڑی دیر بعد کھڑے ہو کر پھر اُسی جملے کو دہرایا۔ حضرت عثمانؓ نے دوسری بار بھی اُسے یہی فرمایا کہ "بیٹھ جاؤ"۔ مگر وہ شخص اپنی حرکت سے باز نہ آیا۔ حضرت عثمانؓ ہر بار نرمی کے ساتھ اُسے بیٹھنے کی تلقین کرتے رہے، لیکن سازش پہلے سے ہو چکی تھی۔ اُس شخص نے مفسدین اور سازشیوں شامل

کے بل بوتے پر ایسی جرأت کی تھی۔ چنانچہ مفسدین نے مسجدِ نبوی میں خلیفۃ المسلمین رضؓ پر سنگریزے اور پتھر برسائے، یہاں تک کہ حضرت عثمان رضؓ زخموں سے چور ہو کر منبرِ رسولؐ سے زمین پر گر پڑے۔

فتنہ و فساد اور شورش و اضطراب کا رفع کرنا اور لوگوں کی جائز شکایتوں کا امکانی حد تک ازالہ کرنا۔ بہر حال حضرت عثمان رضؓ کے پیشِ نظر تھا۔ ادھر دربارِ خلافت میں اِس ابتری کو دُور کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں اور مناسب تدبیریں سوچی جا رہی تھیں۔ اُدھر سازشی اپنا کام کر چکے تھے۔ اِسلامی حکومت کے مختلف گوشوں سے فتنہ پرداز حاجیوں کے بھیس میں مدینے آئے تاکہ زور و قوت کے ساتھ اپنے مطالبات منوائیں اور اگر اُن کے مطالبات پورے نہ کیے جائیں تو خوں ریز شورش برپا کر دیں۔ ایسے نازک موقع پر حضرت عثمان رضؓ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو ان لوگوں کے پاس بھیجا کہ وہ ان کی تسلی و تشفی کر کے واپس جانے پر انھیں رضامند کر لیں۔ چنانچہ وہ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے کہنے سُننے اور سمجھانے سے اُس وقت تو واپسی پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن اس کے بعد وہی لوگ مدینے کی گلیوں میں "انتقام! انتقام!" پکارتے ہوئے نظر آئے۔ حضرت علی رضؓ نے ان سے دریافت کیا کہ "تم یہ کیا کر رہے ہو؟ اِنتقام کا نعرہ کس لیے؟" اِس کے جواب میں اُن لوگوں نے کہا "ہمارے حاکموں کے قتل کیے جانے کے احکام دِیے گئے ہیں۔ اس لیے ہم لوگ واپس آ گئے ہیں"۔ حضرت عثمان رضؓ کو اس واقعے کا علم ہوا تو آپ رضؓ نے لاعلمی ظاہر کی۔ یہ دراصل ان مفسدوں اور شورش پسندوں کی سوچی سمجھی چال تھی کہ اس طرح حضرت عثمان رضؓ کو

بر سرِ اقتدار نہ رہنے دیا جائے ۔

جب حالات اور زیادہ ابتر اور نازک تر ہو گئے تو حضرت عثمانؓ سے خلافت سے دست بردار ہو جانے کے لیے کہا گیا۔ اس پر آپؓ نے فرمایا" جو خلعت مجھے اللہ تعالیٰ نے پہنایا ہے، اسے میں اپنے ہاتھوں سے نہیں اُتاروں گا اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل میں دمِ آخر تک صبر کرُوں گا۔" آپؓ کے اِس انکار پر مفسدین نے کاشانۂ خلافت کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہ محاصرہ اتنا سخت تھا کہ کھانے پکانے کی چیزیں تو ایک طرف رہیں۔ پانی تک اندر نہ پہنچنے دیا۔ مدینے میں جو اکابر صحابہؓ تھے اُنھوں نے باغیوں کو بہت کچھ سمجھایا، مگر اُن پر کسی کی کوئی نصیحت کارگر نہ ہوئی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود بھی متعدد بار باغیوں کو فساد و شورش کے بجائے امن و امان کی تلقین فرمائی۔ یہاں تک کہ اپنے محصور مکان کی چھت پر چڑھ کر آپؓ نے باغیوں کے مجمع سے خطاب فرمایا :۔

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے آئے تو یہ مسجد تنگ تھی۔ آپؐ نے فرمایا" کون اس زمین کو خرید کر مسجد کے لیے وقف کرے گا۔ اِس کے صلے میں اُس کو اس سے بہتر جگہ جنت میں ملے گی۔" تو مَیں نے حضوؐر کے حکم کی تعمیل کی اور تم ہو کہ مجھے اس میں نماز بھی نہیں پڑھنے دیتے۔ تم کو خدا کی قسم دیتا ہوں! بتاؤ، کیا تم جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے تشریف لائے تو اس میں اردمہ کے

سوا میٹھے پانی کا کنواں نہ تھا۔ حضورؐ نے فرمایا "اس کو کون خرید کر عام مسلمانوں کے لیے وقف کرتا ہے؟ اس سے بہتر اسے جنت میں ملے گا۔" تو میں نے ہی اس وقت حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل کی تو کیا اسی کے پانی پینے سے مجھے محروم کر رہے ہو؟ کیا تم جانتے ہو کہ مسلمانوں کا وہ لشکر جو بہت تنگی و عُسرت کی حالت میں تھا اُس لشکر کو میں نے ہی ساز و سامان سے آراستہ کیا تھا؟"

باغیوں نے اس کے جواب میں کہا کہ آپ رضؓ نے جو باتیں کہی ہیں وہ سب سچ ہیں۔ مگر ان سچی باتوں کا اُن سنگدلوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ جو منصوبہ بنا کر آئے تھے اُسے پورا کیے بغیر کسی کی کوئی بات ماننے اور کسی دوسرے رُخ پر سوچنے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ یہ دیکھ کر کہ بلوائی اپنی جگہ سے نہیں ہٹ رہے اور بیت عثمان رضؓ کا محاصرہ بدستور کیے ہوئے ہیں۔ حضرت عثمان رضؓ پھر ان سے مخاطب ہوئے:

"میں خدا کا واسطہ دیتا ہوں۔ بتاؤ کہ حدیبیہ میں حضورؐ نے مجھے سفیر بنا کر مکے نہیں بھیجا تھا اور حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک کو میرا ہاتھ قرار دے کر میری طرف سے خود ہی بیعت نہیں کی تھی؟"

باغیوں نے اس پر یک زبان ہو کر کہا "وہ آپ رضؓ سچ کہہ رہے ہیں، مگر اس کے باوجود باغی آپ رضؓ کے درپے آزار تھے۔ چالیس روز محاصرہ کرنے کے بعد باغی آپ رضؓ کے قتل کے مشورے کرنے لگے۔ آپ رضؓ نے یہ مشورے اپنے کانوں سے سنے تو مجمع سے

آخری بار مخاطب ہو کر فرمایا:۔

"لوگو! آخر کس جرم پر تم میرے خون کے پیاسے ہو؟ اسلام کی شریعت میں کسی کے قتل کی صرف تین ہی صورتیں ہیں۔ یا تو اُس نے بدکاری کی ہو تو اس کو سنگسار کیا جائے گا یا اُس نے بالارادہ کسی کا قتل کیا ہو تو وہ قصاص میں مارا جائے گا۔ یا وہ مرتد ہو تو وہ قتل کیا جائے گا۔ میں نے نہ تو جہالت میں اور نہ اسلام میں کبھی بدکاری کی، نہ کسی کو قتل کیا اور نہ اسلام لانے کے بعد مرتد ہوا۔ میں اب بھی گواہی دیتا ہوں کہ خدا ایک ہے اور محمدؐ اُس کے بندے اور رسولؐ ہیں"۔

لیکن باغیوں پر اس درد انگیز اور صداقت آمیز تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا حضرت عثمانؓ کے بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ اس مکان سے چھپ کر نکل جائیے۔ آپؓ نے اس کے جواب میں فرمایا:۔

"اپنے ہجرت کا مکان اور جوار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہیں چھوڑ سکتا"

حضرت عثمانؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے مطابق یقین تھا کہ آپؓ کی شہادت مقدر ہو چکی ہے۔ اتمام حجت کے لیے جو کچھ آپؓ کر سکتے تھے، وہ آپؓ نے کیا۔ شہادت سے قبل آپؓ نے اپنے بیس غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اپنی اہلیۂ محترمہ سے فرمایا کہ "شہادت کا وقت قریب آ گیا ہے"۔ آپؓ نے تہمد اتار کر پاجامہ پہنا

اور قرآن شریف کھول کر تلاوت میں مصروف ہو گئے۔ باغی مکان میں گھس آئے۔ حضرت علیؓ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ جو دروازے پر مدافعتِ عثمانؓ کے لیے متعین تھے، وہ بھی زخمی ہو گئے۔ باغیوں میں سے ایک سنگدل نے لوہے کا ٹکڑا اس زور سے حضرت عثمانؓ کی پیشانی مبارک پر مارا کہ آپؓ اس کاری چوٹ کی تاب نہ لا کر پہلو کے بل گر پڑے۔ دوسرے باغی نے ایک اور ضرب لگائی۔ جسم سے خون بہنے لگا۔ ان باغیوں میں ایک سے ایک زیادہ سنگدل تھا۔ یہاں تک کہ ایک شقی تو سینۂ مطہر پر چڑھ گیا اور پے در پے وار کرنے لگا۔ پھر ایک اور باغی نے بڑھ کر تلوار کا وار کیا۔ وفادار بیوی نے جو مظلوم شوہر کے پاس ہی بیٹھی تھی، اس وار کو روکنا چاہا۔ اُن کی تین اُنگلیاں کٹ کر گر پڑیں۔ آپؓ اس عالم میں قرآن شریف کے یہ الفاظ تلاوت کر رہے تھے:

(مفہوم) "خدا تم کو بس ہے اور وہ سُننے اور جاننے والا ہے۔"

جمعے کے دن عصر کے وقت شہادت پائی۔

باغیوں کی شورش اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ دو دن تک حضرت عثمانؓ کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔ ہفتے کا دن گزرنے کے بعد رات کی تاریکی میں صرف سترہ آدمیوں نے مدینے سے کابل و مراکش تک کے اسلامی فرمانروا کے جنازے کی نماز پڑھی اور غسل دیے بغیر خون آلود پیرہن میں حلم و بردباری، غیرت و حیا کے مجسّمے اور عصمت و شرافت کے اس پیکر کو جنت البقیع میں سپردِ خاک کر دیا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ٥

حضرت علی مرتضیٰ کرّم اللہ وجہہٗ

حضرت علیؓ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے چچا ابو طالب کے فرزند تھے۔ بچپن ہی سے حضورؐ کی خواہش کے مطابق آپؓ کے والد نے آپؓ کی کفالت حضورؐ کے سپرد کر دی۔ آپؓ کی والدہ ماجدہ کا نام فاطمہؓ بنت اسد تھا جنھوں نے بڑی شفقت و محبت کے ساتھ حضرت علیؓ کی پرورش کی۔ آپؓ پہلی ہاشمی خاتون تھیں جو اسلام لائیں اور ہجرت کر کے مدینے گئیں۔ وہاں جب آپؓ کا انتقال ہوا تو حضورؐ نے ان کے کفن کے لیے اپنا مبارک کُرتہ عطا فرمایا اور قبر میں برکت کے لیے لیٹ گئے۔

حضرت علیؓ مکّے میں رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کے گھر میں رہتے تھے اور حضورؐ کی تربیت و نگرانی میں نشو و نما پا رہے تھے۔ آپؓ دس گیارہ برس کے تھے کہ ایک دن باہر سے گھر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضورؐ اور سیّدہ خدیجہؓ نماز ادا کر رہے ہیں۔ آپؓ نے اپنی آنکھوں سے سجدہ اور رکوع کا منظر دیکھا۔ قرآنِ کریم کی قراءت سنی۔ جب حضورؐ نماز ختم کر چکے تو حضرت علیؓ نے دریافت کیا کہ آپؐ کس کو سجدہ کر رہے تھے؟"

حضورؐ نے فرمایا "اے علیؓ! یہ سجدہ اُس خدا کے حضور میں ہے، جس نے مجھے نبوت عطا فرما کر لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کا حکم دیا۔ تم بھی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کرو۔ میری نبوت پر ایمان لاؤ"۔ پھر قرآنِ کریم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ میں اس معاملے میں اپنے باپ سے مشورہ کرلوں اور ساری رات بڑے اضطراب اور غور و فکر کے عالم میں گزاری۔

حضرت علیؓ فطرۃً ذہین اور طباع تھے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ تربیت نے اس جوہر کو اور چمکا دیا۔ آپؓ اگلے دن جب حضورؐ کے سامنے آئے تو ہاشمی خانوادے کے اس نونہال نے کہا:

"اللہ تعالیٰ نے مجھے میرے باپ کے مشورے کے بغیر پیدا کیا۔
پھر میں اُس کی عبادت کے لیے اپنے باپ کی رائے کیوں لوں؟"

بچوں میں سب سے پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ آپؓ کا آئینۂ قلب پہلے ہی سے مجلا تھا۔ آفتابِ نبوت کے پرتو کو فوراً قبول کرلیا۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتے داروں اور کنبے قبیلے کے آدمیوں کو اسلام کی دعوت دی اور اس کے لیے حضورؐ نے ایک دن کھانے پر سب کو بُلایا تو حضورؐ کی تبلیغ و تلقین پر کسی نے غور نہ کیا۔ ان میں صرف علیؓ تھے جو اٹھے اور اس بھری مجلس میں فرمایا:

"اگرچہ میں عمر میں سب سے چھوٹا ہوں۔ مجھے آشوبِ چشم کا عارضہ

بھی ہے اور ٹانگیں پتلی ہیں۔ تاہم میں آپؐ کا دست و بازو بنوں گا
اور آپؐ کی رفاقت کروں گا۔"

اسلام کا اعلان کرتے ہی سارا مکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہوگیا۔ حضوؐر کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں اور تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ حضرت علیؓ ظلم و ستم کے اس خارزار میں رسوؐل اللہ کے ساتھ تھے۔ کفارِ مکہ نے جب یہ دیکھا کہ ہماری تمام کوششوں تدبیروں اور ستم رانیوں کے باوجود اسلام بڑھتا اور ترقی کرتا جارہا ہے تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ اس عالم میں اللہ تعالیٰ نے حضوؐر کو مکے سے ہجرت کرکے مدینے جانے کا حکم دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آج کی رات تم میرے بستر پر رات بسر کرو گے۔ چنانچہ علیؓ حضوؐر کے بستر پر لیٹ گئے اور حضوؐر نے آپؓ کو اپنی چادر اڑھا دی۔ آج کی رات حضوؐر کے بستر پر سونا گویا قتل گاہ میں سونا تھا، مگر علیؓ مرتضیٰ کے سامنے رسُولؐ اللہ کا فرمان تھا، اس لیے آپؓ قتل و ہلاکت کے مہیب خطروں میں نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ سوتے رہے۔ صبح کے وقت مُشرکین نے دیکھا کہ محمدؐ ابن عبداللہ کی جگہ علیؓ ابن ابی طالب سو رہے ہیں تو وہ اپنی غفلت پر نادم ہوئے۔ حضرت علیؓ دو تین دن مکے میں ٹھیرے رہے اور حضوؐر کے ارشاد کے مطابق لوگوں کو اُن کی امانتیں دے کر مدینے کو روانہ ہوگئے۔ مدینے میں جب حضوؐر نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ (مواخاۃ) کرائی تو حضرت علیؓ کو اپنا بھائی بنا لیا۔

مدینے میں اشاعتِ اسلام اور ملت کی بنیاد کے استحکام کے لیے جتنے کام

ہوئے، حضرت علیؓ ان سب میں شریک تھے۔ مدینے میں مسجد جب تعمیر ہونے لگی تو آپؓ نے اینٹیں ڈھونے اور گارا دینے کی خدمت انجام دی۔

دوسرے سنہ ہجری میں حضرت علیؓ کا نکاح حضورؐ کی محبوب ترین صاحبزادی حضرت سیدۃ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے ہوا اور گیارہ مہینے کے بعد رخصتی ہوئی۔ انسانیت کی تاریخ اور فقر و سادگی کے باب میں یہ واقعہ بھی ہمیشہ یادگار رہے گا کہ سرورِ کائنات نے اپنی پیاری بیٹی کے جہیز میں ایک پلنگ، ایک بستر، ایک چادر اور دو چکیاں اور ایک مشکیزہ دیا۔ حضرت علیؓ تمام عمر اس اثاثے میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔ آپؓ نے اپنی زرہ فروخت کر کے دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا۔

غزوۂ تبوک میں جاتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اہلِ بیتؓ کی نگرانی کے لیے مدینے میں اپنا قائم مقام بنایا۔ تبوک کے علاوہ تمام جنگوں میں حضرت علیؓ نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اور "اسد اللہ" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ جنگِ احد میں آپؓ کے جسم پر سولہ زخم آئے۔ فتحِ خیبر کے لیے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے اکابر صحابہؓ مامور ہوئے مگر خیبر فتح نہ ہو سکا۔ پھر حضورؐ نے آپ ارشاد فرمایا:۔

"کل مَیں اُس شخص کو علَم دوں گا، جس کے ہاتھ پر خدا فتح دے گا اور جو خدا اور خدا کے رسولؐ کو چاہتا ہے اور خدا اور خدا کا رسولؐ بھی اس کو چاہتے ہیں۔"

ہر صحابیؓ اس شرف کا امیدوار تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کے لیے یہ

شرف مقدر فرما دیا تھا۔ حضورؐ نے علَم حضرت علیؓ کو عطا فرمایا اور شیرِ خدا کے ایک ہی حملے میں خیبر فتح ہو گیا۔ عشقِ رسولؐ کی یہ کیفیت تھی کہ صلحِ حدیبیہ کے معاہدے میں کفار نے لفظ "رسولؐ اللہ" پر اعتراض کیا تو حضورؐ کے ارشاد کے باوجود لفظ "رسولؐ اللہ" حضرت علیؓ نے نہیں مٹایا۔

فتحِ مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانۂ کعبہ میں داخل ہوئے اور وہاں کے بُتوں کو اپنے دستِ مبارک سے توڑا۔ ایک بُت جو اونچائی پر زمین میں گڑی ہوئی سلاخ میں پیوست تھا باقی رہ گیا۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ "حضورؐ میرے کاندھوں پر چڑھ کر اس بت کو توڑ دیں"۔ حضورؐ نے فرمایا "اے علیؓ! تم نبوت کے بار کو نہیں اُٹھا سکو گے"۔ اس لیے حضرت علیؓ نے حضورؐ کے شانوں پر کھڑے ہو کر اس بت کو پاش پاش کر دیا۔ یمن میں اسلام کی تبلیغ کے لیے جب حضرت علیؓ منتخب ہوئے تو عرض کیا "یا رسول اللہ! جس قوم کی طرف مجھے بھیجا جا رہا ہے اس میں مجھ سے زیادہ تجربہ کار اور بڑی عمر کے لوگ پائے جاتے ہیں، اُن کے معاملات کا فیصلہ کرنا میرے لیے دشوار ہو گا"۔ اس پر حضورؐ نے حضرت علیؓ کے سینے پر دستِ مبارک رکھا اور دعا کی:

"اے اللہ! اس کی زبان کو راست گو بنا دے اور اس کے دل کو ہدایت کے نور سے منور فرما دے"۔

اس کے بعد حضورؐ نے آپؓ کے سر پر اپنے ہاتھ سے عمامہ باندھا اور "اسد اللہ" کا خطاب عطا فرمایا اور علیؓ مرتضیٰ کے بارے میں یہ بھی کہا:۔

"جو علیؓ کا دوست ہے۔ وہ میرا بھی دوست ہے۔"

پھر دُعا کی:

"یا اللہ! جو شخص علیؓ سے محبت رکھے، تو اس سے محبت رکھ!"

حضورؐ ایک دن مسجدِ نبوی میں تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت علیؓ فرشِ خاک پر گہری نیند سو رہے ہیں۔ حضورؐ نے اپنے ہاتھوں سے آپؓ کے کپڑوں سے گرد و غبار دور فرماتے ہوئے کہا:

"اُٹھ! ابو تراب!"

حضورؐ کے اس ارشاد اور خطاب میں یہ رمز پنہاں تھا کہ حضرت علیؓ کو اپنے خاکی جسم پر پورا قبضہ حاصل ہے اور آپؓ کے اعضاء و جوارح اللہ اور رسولؐ کی مرضی کے مطابق اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ خطاب حضرت علیؓ کے احوال کی تصدیق بھی تھا اور مستقبل کے لیے دعا بھی۔

حضرت علیؓ کو بچپن ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی سعادت حاصل رہی۔ حضورؐ نے بہ نفسِ نفیس آپؓ کو قرآن و حکمت کی تعلیم دی۔ قرآنِ کریم جو دینی علوم و معارف کا سرچشمہ ہے، اُس سے آپؓ پوری طرح سیراب تھے۔ آپؓ کا شمار ان صحابہؓ میں ہوتا تھا، جنھوں نے حضورؐ کی زندگی میں نہ صرف یہ کہ پورا قرآن زبانی یاد کر لیا تھا، بلکہ اس کی ایک ایک آیت کے معنی اور شانِ نزول سے واقف تھے۔ آپؓ نے بچپن سے لے کر وفاتِ نبیؐ تک تقریباً تیس سال حضورؐ کی خدمت و رفاقت میں بسر کیے۔ اس مسلسل رفاقت و محبت کے سبب آپؓ اسلام کے احکام، فرائض اور ارشاداتِ

نبوی کے سب سے زیادہ جاننے والے اور سب سے بڑے عالم تھے۔ آپؓ کو فقہ و اجتہاد میں کامل دسترس اور غیر معمولی بصیرت حاصل تھی۔ چونکہ عالمِ طفولیت ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ عاطفت میں تربیت پائی تھی، اس لیے اخلاق و تقویٰ میں اپنی نظیر آپ تھے۔ آپؓ نے اسلام لانے سے پہلے کسی بُت کو سجدہ نہیں کیا۔ شرک و کفر کا کوئی کلمہ آپؓ کی زبان سے نہیں نکلا اور شراب نہیں چکھی۔[1]

حضرت علیؓ کی ذاتِ گرامی زہد و ورع اور فقر و سادگی کا نمونہ تھی۔ گھر میں کوئی خادم نہ تھا۔ چکی پیستے پیستے حضرت سیدہ فاطمہؓ کے مقدس ہاتھوں میں گھٹے پڑ

---

[1] سیرۃ النبیؐ، جلد دوم، صفحہ ۱۴۲ ۔ مطبع معارف اعظم گڑھ میں مؤلف نے تحقیق کے بغیر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے قبلِ اسلام شراب پینے کا واقعہ منسوب کر دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اسی ادارے کی ایک دوسری تالیف "خلفائے راشدینؓ" (اخلاق و عادات ــــ ذاتی حالات) میں صفحہ ۲۵۶ پر اس واقعے کی تصحیح ان لفظوں میں کر دی گئی ہے :-

"اب حاکم کی "مستدرک" چھپ چکی ہے۔ اس کی روایت سے اصلی واقعہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ واقعہ ایک اور شخص کا بیان کیا تھا، مگر راوی نے خود حضرت علیؓ کا نام رکھ دیا۔ حاکم نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ بحمد اللہ اس روایت سے حضرت علیؓ کے مخالفین جو اعتراض آپؓ پر کرتے تھے وہ اٹھ گیا"

شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے شراب پینا گناہ نہ تھا تاہم کمالِ تقویٰ کے خلاف ضرور تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے علیؓ نے اس دور میں بھی جامِ شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ تقویٰ اور طہارت حضرت علیؓ کی گھٹی میں پڑی تھی۔

گئے تھے۔ گھر میں اوڑھنے کے لیے صرف ایک ہی چادر تھی۔ معاش کی اس قدر تنگی تھی کہ کئی کئی دن گھر میں کھانا پکانے کے لیے آگ نہ جلتی۔ تھوڑی بہت کھجوریں کھالیں اور ان پر پانی پی لیا۔ بعض اوقات کھجوریں بھی میسر نہ آتیں تو فاقوں کی نوبت آجاتی۔ حضرت علیؓ بھوک کی شدت سے شکم مبارک پر پتھر باندھ لیتے۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اپنے اپنے دورِ خلافت میں حضرت علیؓ سے امورِ سلطنت میں مشورہ کرتے تھے۔ آپؓ کے فیصلے صائب اور آپؓ کی رائے مخلصانہ اور خیرخواہانہ ہوتی تھی اسی رفاقت، دوستی اور باہمی روابط کی خوشگواری کا سبب تھا کہ ایک طرف اسلامی حکومت کو انتہائی استحکام اور قوت حاصل تھی اور دوسری طرف مفسدین اور معاندینِ اسلام کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں کامیابی کا منہ نہ دیکھ سکیں۔

حضرت علیؓ نے ذہنِ رسا اور روشن فکر پائی تھی۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل میں آپؓ کی نگاہِ نکتہ رس معاملے کی تہ تک پہنچ جاتی۔ جس طرح آپؓ اشجع الناس یعنی سب سے زیادہ بہادر تھے۔ اسی طرح افقہ یعنی فیصلہ چکانے میں سب سے بڑے جج (قاضی) بھی تھے۔ فصاحت و بلاغت تو آپؓ کے لبوں کو چومتی تھی اور تقریر و خطابت آپؓ کے گھر کی کنیزیں تھیں۔ آپؓ کو شعر کا بھی ذوق تھا۔ بعض اشعار آپؓ سے منسوب ہیں آپؓ نے علمِ نحو کی بنیاد رکھی تھی۔ صحابہ کرام نے حضرت علیؓ کے بارے میں یہ حدیث سُنی تھی:

"میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔"

حضرت علیؓ زاہد تھے۔ اہلِ تقویٰ تھے۔ برائیوں کے مٹانے اور نیکیوں کے قائم کرنے والے تھے۔ مگر اس کے ساتھ طبیعت میں جائز حدود تک ظرافت بھی پائی

جاتی تھی۔ زُہد کے ساتھ خوش طبعی کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔

حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں فتنہ و فساد برپا ہوا تو اس کے رفع کرنے کے لیے آپؓ نے مناسب مشورے دیے اور جب باغیوں نے بیتِ عثمانؓ کا محاصرہ کر لیا تو اپنے صاحبزادوں کو حضرت عثمانؓ کی مدافعت و محافظت کے لیے بھیجا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد تین دن تک مسندِ خلافت خالی رہی۔ اس عرصے میں لوگوں نے حضرت علیؓ سے اس منصبِ عظیم کے قبول کرنے کے لیے اصرار کیا تو آپؓ نے انکار کر دیا۔ آخر مہاجرین اور انصار کے مسلسل تقاضوں پر رضامند ہو گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جو اندوہناک حالات پیش آئے، حضرت علیؓ کی نگاہ میں اُن کا سبب حکومت کے عمال (گورنروں) کی بے اعتدالیاں تھیں۔ اس لیے آپؓ نے عہدِ خلافتِ عثمانی کے عمال کو برطرف فرما کر نئے عمال صُوبوں میں مقرر کیے۔ تمام عمال نے خلیفۃ المسلمین اور امیر المؤمنین کے حکم کے آگے سرِتسلیم خم کر دیا، مگر امیرِ معاویہؓ جو شام کے حاکم تھے۔ انھوں نے سرتابی اور حکم عدولی کی۔ حضرت علیؓ نے اسی وقت محسوس کیا کہ میری خلافت جھگڑوں سے خالی نہیں ہے۔ آپؓ کا یہ اندازہ بالکل صحیح نکلا اور یہ اندیشہ واقعہ بن گیا۔

جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ شہید ہوے ہیں تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مکے میں تھیں۔ عمرے سے فارغ ہو کر جب آپؓ مدینے روانہ ہوئیں تو راستے میں حضرت عثمانؓ کی شہادت اور حضرت علیؓ کے خلیفہ ہونے کی خبر ملی۔ جسے

سُن کر آپؓ مکے کو واپس ہوگئیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے جو سب سے زیادہ نازک مسئلہ آیا، وہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا پتہ لگا کر اُن سے قصاص لینا تھا۔ حضرت عائشہؓ، امیر معاویہؓ اور بعض دوسرے حضرات نے حضرت علیؓ سے قاتلینِ عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کیا اور کہا کہ جب آپ نے اس منصبِ عظیم کو قبول کیا ہے تو قاتلینِ عثمانؓ کا پتہ بھی لگایئے اور انھیں فرار واقعی سزا دیجیے، مگر حالات کچھ ایسے تھے کہ قاتلینِ عثمانؓ کا پتہ لگانا حضرت علیؓ کے لیے دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ بلوہ، بغاوت، مار دھاڑ اور افراتفری میں جہاں ہزاروں آدمی موجود ہوں، وہاں خود بغاوت کرنے والوں تک کو اس کا پتہ نہیں ہوتا کہ کس نے کس کو قتل کیا اور صرف افواہ اور سنی سُنائی باتوں پر کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ قتلِ عمد کے لیے عینی شہادت ضروری ہے۔

قاتلینِ عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ زور پکڑتا گیا اور لوگ جوق در جوق اور گروہ در گروہ حضرت عائشہؓ کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ صدیقہ تیس ہزار فوج لے کر بصرے کی جانب روانہ ہوئیں اور حضرت علیؓ مدینے سے بیس ہزار کا لشکر لے کر نکلے۔ بصرے سے چند میل کی مسافت پر دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی۔

حضرت عائشہؓ لڑائی کے وقت اونٹ پر سوار تھیں اور یہ اونٹ ہی جنگ کا محور بن گیا تھا۔ اس لیے یہ لڑائی "جنگِ جمل" (اُونٹ) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں دونوں طرف کے بہت سے مسلمان کام آئے۔ کیا قیامت تھی کہ غلط فہمیوں کے سبب مسلمان مسلمان پر تلوار چلا رہا تھا۔ یہاں تک کہ لشکرِ علیؓ مرتضیٰ کو غلبہ حاصل ہوا،

اور حضرت علیؓ نے امّ المومنین حضرت عائشہؓ کو پورے اعزاز و احترام سے امام حسنؓ اور محمّدؐ بن ابوبکرؓ کے ساتھ مدینے بھیج دیا۔ حضرت عائشہؓ اپنے اس اقدام پر افسوس کیا کرتی تھیں حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ حضرت علیؓ کو حجاز سے دارالحکومت عراق کو منتقل کرنا پڑا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ کی طرف پیش قدمی فرمائی اور صفین میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی فوجوں کی خوں ریز جنگ ہوئی۔

جمل کے بعد اسلامی تاریخ کا دوسرا اندوہناک حادثہ جنگِ صفین ہے۔ صفین کے بعد مسلمانوں کی حکومت "دو عملی" سے پہلی بار آشنا ہوئی۔ ایک طرف حضرت علیؓ کی خلافت تھی اور دوسری طرف شام میں امیر معاویہؓ کی حکومت۔

حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ خانہ جنگیوں اور شورشوں ہی کی نذر ہو گیا اور تقریبًا پانچ سال کی مدت میں ایک لمحہ بھی آپؓ کو سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ جمل و صفین کی جنگیں ہوئیں۔ خوارج کا فتنہ اُٹھا، لیکن اس کش مکش و اضطراب میں بھی حضرت علیؓ نے عدل و انصاف کے زرّیں اصولوں کو پیشِ نظر رکھا۔ آپؓ جب کسی عامل کو مقرر فرماتے تو اسے اللہ کا خوف دلاتے اور لوگوں سے بھلائی اور نیکی کے ساتھ پیش آنے کی نصیحت کرتے عمّال سے مالیات میں کوئی بے اعتدالی ہو جاتی تو سختی کے ساتھ باز پرس فرماتے۔ آپؓ نے صیغۂ محاصل میں خاص اصلاحات جاری کیں اور جنگلات کو محاصلِ ملکی میں شامل کیا اور گھوڑوں کی افزائش نسل کے لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے کی طرح ان پر زکوٰۃ موقوف کر دی حضرت علیؓ نے بیت المال کے دروازے غرباء اور مساکین کے لیے کھول دیے۔ ایران میں اسلامی حکومت کے خلاف خفیہ سازشیں ہوتی رہیں، لیکن آپؓ نے

ہمیشہ شفقت و ترحم سے کام لیا۔ ایرانی آپؓ کے اس سلوک کو دیکھ کر کہنے لگے' خدا کی قسم! اس عربی نے تو نوشیرواں کی یاد تازہ کر دی۔

زمامِ خلافت سنبھالنے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو بڑے شدید اضطرابات اور کش مکشوں سے گزرنا پڑا۔ آئے دن نئے نئے فتنے اور طرح طرح کی شورشیں' مگر اس کے باوجود آپؓ نے ملک کی ترقی اور دین کی خدمت کے لیے جو کچھ ان شر انگیز حالات میں ہو سکتا تھا' اُس سے دریغ نہیں کیا۔ آپؓ کے زمانے میں دریائے فرات پر پُل باندھا گیا' جو نومسلم مُرتد ہو گئے تھے' ان کی پوری طرح سرکوبی کی گئی۔

حضرت علیؓ اُس ذاتِ گرامیؐ کے تربیت یافتہ تھے' جس کو قوم نے اپنے ایام جاہلیت میں "الامین" کا خطاب دیا تھا۔ اس لیے علیؓ ابنِ ابی طالب بھی ابتدا ہی سے امانت و دیانت کے تقاضوں کو پہچانتے تھے۔ ایک دفعہ نارنگیاں آئیں' جن میں سے چند حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے اُٹھا لیں تو آپؓ نے پیارے بیٹوں اور دل و جگر کے ٹکڑوں کے ہاتھ سے نارنگیاں چھین کر لوگوں میں بانٹ دیں۔

دورِ خلافت میں بھی آپؓ کے زہد و تقویٰ اور فقر و سادگی کا وہی عالم رہا اور آپؓ کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نہ دولت کدے پر پہرہ چوکی' نہ امیرانہ ٹھاٹ باٹ۔ غذا جَو کی روٹی اور لباس' پیوند لگے کپڑے۔ اس پر فیاضی' سخاوت اور دریا دلی کا یہ عالم کہ خود فاقوں کی نوبت آجاتی اور سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹنے دیتے اُس وقت جبکہ قیصر و کسریٰ کی حکومتیں مسلمانوں کے لیے زر و جواہر اُگل رہی تھیں مسلمانوں کا خلیفہ اور امیر ایک معمولی آدمی کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک بار خطبہ دیتے ہوئے

ارشاد فرمایا "میری تلوار کوئی خریدتا ہے؟ خدا کی قسم! میرے پاس اگر تہہ بند کی قیمت بھی ہوتی تو اس تلوار کو فروخت نہ کرتا۔" ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا "امیرالمؤمنینؓ میں تہہ بند خریدنے کے لیے اس کی قیمت کی رقم قرض دیتا ہوں۔"

فقر و سادگی حضرت علیؓ کے کردار سیرت کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی للّٰہیت اور بے نفسی کا نمونہ تھی آپؓ کی زندگی: اپنے ہاتھ سے کام کاج اور محنت و مزدوری کرنے میں بھی کوئی عار نہ تھا۔ ایک بار بازار میں گشت کر رہے تھے۔ ایک شخص تعظیماً آپؓ کے پیچھے ہولیا۔ آپؓ نے فرمایا۔ "اس میں والی کے لیے فتنہ اور مومن کے لیے ذلت ہے۔" آپؓ جب نماز کا قصد فرماتے تھے تو بدن میں لرزہ پڑجاتا تھا اور رنگ متغیر ہو جاتا تھا اور فرماتے تھے کہ "وہ امانت اٹھانے کا وقت آیا ہے کہ ساتوں زمین و آسمان جس کے متحمل نہ ہو سکے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات میں عجیب جامعیت، محبوبیت اور مرکزیت پائی جاتی ہے۔ صوفی، ارباب نحو، اہل فصاحت یہاں تک کہ پہلوان اور سپہ گر آپؓ کی ذات سے نسبت پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

۴۰ھ ہجری کا واقعہ ہے، جب حج کے موقع پر خوارج جو اندرونی خانہ جنگیوں سے تنگ آچکے تھے اور اپنی دانست اور زعم میں حالات کی اصلاح سے مایوس اور دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے بہ اتفاق رائے یہ طے کیا کہ جب تک حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور عمروؓ بن عاص دنیا میں پائے جاتے ہیں، اس وقت تک اسلام کو خانہ جنگیوں اور آپس کی نزاع سے فرصت نہیں مل سکتی۔ چنانچہ عبدالرحمٰن ابن ملجم نے

حضرت علیؓ، نزال نے امیر معاویہؓ اور عبداللہ نے عمرؓو بن عاص پر بہ یک وقت قاتلانہ حملہ کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ اسی سال (۴۰ھ) رمضان کے مہینے میں حضرت علیؓ کوفے کی جامع مسجد میں تشریف لائے اور ابنِ ملجم کو جو مسجد میں سو رہا تھا جگایا آپؓ نے نماز شروع کی۔ سر سجدے میں اور دل راز و نیازِ الٰہی میں مصروف تھا کہ اتنے میں ابنِ ملجم نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے آپؓ پر وار کیا۔ زخم سر پر آیا۔ لوگوں نے قاتل کو پکڑ لیا۔ زہر آلود تلوار کا زخم اور کاری زخم، حالت نازک سے نازک تر ہوتی چلی گئی۔ جب افاقے کی امید نہ رہی تو آپؓ نے حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو بلا کر مفید نصیحتیں فرمائیں۔ اپنے قاتل کے متعلق کہا کہ "معمولی طور پر قصاص لینا"۔

بالآخر ۲۰ رمضان المبارک ۴۰ھ ہجری جمعے کی شب میں تریسٹھ سال کی عمر میں شہادت پائی۔ تقریباً اسی عمر میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا وصال ہوا تھا۔ حضرت امام حسنؑ نے خود اپنے ہاتھوں سے تجہیز و تکفین کی اور ابو ترابؓ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ٥

کتبہٗ

جمیل احمد قریشی تنویر رقم

محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

اور

محسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم

از

فقیر سید وحید الدین

دفتر

فقیر سپننگ ملز لمیٹڈ

۱/۳۶ کیمبل سٹریٹ ، کراچی (پاکستان)